اقبال کی پیشگوئیاں

ڈاکٹر ہاشمی

مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

اقبال کی پیشگوئیاں

مرتبہ
ڈاکٹر ہاشمی

ناشرین
شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ پرنٹرز پبلشرز کشمیری بازار لاہور
برانچیں
لاہور - کراچی - پشاور - حیدر آباد

سلسلہ مطبوعات ۶۷

بار دوم

فروری ۱۹۶۲ء

قیمت ۔ ۔ ۔ ۔ تین روپے

شیخ نیاز احمد پرنٹر پبلشر نے اپنے علمی پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپوا کر
شیخ غلام علی اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور سے شایع کیا

اقبالؒ کی پیش گوئیاں

جہانبانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(اقبالؒ)

نغمہ ام، از زخمہ بے پرواستم
من نوای شاعر فرداستم (اقبالؒ)

علامہ اقبالؒ کی پیش گوئیاں

اِس مختصر تالیف میں دُنیا کے اہم حالات و رجحانات کی بابت علامہ اقبالؒ کی پیش گوئیاں مع تشریحات درج کی گئی ہیں ۔ جن میں سے ملّتِ اسلامیہ و عامۃ المسلمین کی بابت خوش آیند پیش گوئیاں بالخصوص ان کے لیے قابلِ مطالعہ ہیں جو اسلام کے روشن مستقبل سے مایوس ہیں ۔ علاوہ ازیں ہمارا فرض ہے کہ ہم مفکرِ پاکستان کی پیش گوئیاں پاکستان و دیگر ممالکِ اسلامیہ کی بابت بخوبی جانیں تاکہ ان کی ہدایت آگیں روشنی میں ہم اپنے افکار و اعمال سیاسیہ و اخلاقیہ کو بآسانی مرتب کر سکیں۔

مرتبہ

ڈاکٹر سید یمین ہاشمی

ال۔ ال۔ بی، ایم۔ اے (علیگ) پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن)

پروفیسر، سندھ مسلم کالج، کراچی

سکریٹری، اقبالؒ اکیڈمی، سندھ یونیورسٹی

انتساب بہ رُوحِ اقبالؒ

"تمھاری نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں"
کہ جس میں حُسنِ عقیدت مرا جھلکتا ہے

ڈاکٹر اقبال! تو ہے ملہمِ رازِ حیات
واقفِ اسرارِ ہستی صاحبِ رازِ حیات
ہمت افزائے دلِ مسلم ہے تیری شاعری
پست ہمت بھی نظر آتے ہیں بانیازِ حیات
بادۂ عرفاں جو ساقی نے پلائی ہے تجھے
ہاشمی کو بھی چکھا دے وہ مئے رازِ حیات

میں نے ۳۳ء میں ایک نظم بغرض [illegible] قطعہ مذکورہ بالا علامہ کی خدمت میں روانہ کی تھی۔ جس کے جواب میں گرامی نامہ مندرجہ بالا موصول ہوا۔ میرے پاس علامہ کے متعدد غیر مطبوعہ نہایت معتبر خطوط ہیں جنھیں میں عنقریب اپنی زیر تالیف "علامہ اقبال کے نادر خطوط" کے نام سے شائع کرنے والا ہوں۔

فہرست مضامین

(ہر فصل کی ابتداء میں اُس باب کے مشمولہ مضامین کی فہرست درج ہے)

ضمیمہ جات

نقشہ و تصاویر

دیباچہ

ہاں یہ سچ ہے چشم بر عہدِ کہن رکھتا ہوں میں   اہلِ محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں
(اقبالؒ)

یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے   میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے

ہڈسن (HUDSON) کا خیال ہے کہ کوئی شخص کسی تصنیف کے پڑھنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن میں اس سے اُن تصنیفات کو مستثنیٰ کردوں گا جو اقوام کو شاہراہِ حیات دکھا کر وعدے وعید دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کا مطالعہ قانوناً لازم قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ ان سے بے خبری نہ صرف اقوام کو بلکہ دُنیا کو جہنم میں جھونک دیتی ہے۔ ایسی کتابوں میں قرآن مجید کا اوّل درجہ ہے۔ آج اس سے بے خبری مسلمانوں کے زوال کی تنہا ذمہ دار ہے۔

اسلام کے طرزِ جمہوری میں زوال آیا تو معتقدین کی ذہنیت میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی۔

بہ ہر زمانہ بہ اسلوبِ تازہ می گویند   (اقبالؒ)

قرآن کی مبشّرانہ و منذرانہ اسپرٹ تو ہاتھ سے نہ چھوٹی، لیکن "سرِ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں" شعارِ سخن ٹھہرا۔ زمانہ نے پھر کروٹ لی، رومیؒ کی روحِ مصفّیٰ لاہور کے کھنڈروں سے جاگی۔ اس مبصّرِ حیات نے دنیا کے سامنے پیامِ قرآنیہ نئے طرز میں پیش کیا۔ جس سے غفلت میرے خیال میں جرمِ عظیم ہے۔

اقبالؒ ملّتِ اسلامیہ کے تخیلی احیاء کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آج مسلمانانِ برّصغیر نے اُس کے کلام کے ساتھ اعتنا برتا ہے اور اس کے فلسفہ کے تقریباً تمامی پہلو پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ بااین ہمہ میرا خیال ہے کہ اقبالؒ کی پیش گوئیوں کی اہمیت اب تک مبصّرین کی نظروں سے پوشیدہ رہی۔ جن کی رو شناسی کا فخر آج مجھے حاصل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قارئین ان صفحات کو پڑھ کر اُن

پیش گوئیوں کی تکمیل میں ؎ "ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظرِ فردا" نہ بنیں گے۔ بلکہ اس کے لیے وہ سعیٔ عمل دکھائیں گے جو "ذوقِ یقین" کا تقاضا ہے۔

ہمیں تاریخ اقوامِ عالم سے ایک سبق ملتا ہے۔

کوئی قوم اپنے زوال کی درمیانی منزلوں سے ترقی کی طرف واپس نہیں جاتی۔ قوتِ متعارض کا عمل حقیقی ذلت پر پہنچنے کے بعد شروع ہوتا ہے:

خدا نے اُنھیں فنا کر دیا، اس لیے کہ وہ موت سے ڈرتے تھے

پھر اُس نے اُنھیں دوبارہ زندگی عطا کی (۲/۲۴۳)

بقول اقبالؒ۔ اسلام ۱۷۹۹ء میں اس مقام پر پہنچ چکا تھا اور اب اس نے کروٹ لی ہے۔ لیکن احیائے ملت ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ بس آج سے عہد کر لیں کہ قرآن کریم کے اس چودھویں صدی کے مفسر کا پیام آپ کا مشعلِ ہدایت ہوگا اور اگر آپ نے اس عہد کی تکمیل کی تو خدا بھی اپنا وعدہ پورا کرنے میں دریغ نہیں فرمائے گا اور وہ پیش گوئیاں جو اقبالؒ نے اسلام کے بارے میں کی ہیں پوری ہو کر رہیں گی ؎

یقین افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے ۔۔۔ یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

اس تالیف کی خصوصیات کا ذکر بے کار ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اسے کسی مجذوب کی پیش گوئیوں کا مجموعہ نہ بناؤں۔ ہر پیش بینی قرآن و احادیث و تاریخی روایات سے ثابت کی گئی ہے اور گو جابجا توضیحات و تشریحات نے مبحث کو مطول بنا دیا ہے لیکن کوئی صورت تشنۂ تکمیل نہیں چھوڑی گئی۔

ضمیمہ (الف) میں علّامہ اقبالؒ کی مخصوص شاعرانہ پیش گوئیوں کو یک جا کر دیا گیا ہے۔

ضمیمہ (ب) اسکاون بلنٹ کی نادر الوجود تصنیف "مستقبل اسلام" کی تلخیص پر مشتمل ہے۔ اُس کے متن سے قبل ایک مختصر تمہید میں اس کی خصوصیات بیان کر دی گئی ہیں۔

چونکہ اس تالیف میں بیشتر اشارات جغرافیائی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس لیے ایک مفید نقشہ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہر سہ تصاویر قارئین کی دلچسپی میں اضافہ کریں گی۔

قارئین ہر صفحہ کے سرنامہ پر ایک مصرعہ لکھا ہوا پائیں گے۔ یہ سب علّامہ اقبالؒ کے جواہر پارے ہیں۔ یہ حرف

تزئین صفحات کے لیے نہیں ہیں بلکہ اس میں دو اغراض شامل ہیں (۱) مس اکم جمیس نے اپنی دلچسپ کتاب "ضرب الامثال کے جواہر پارے" میں اس قسم کے فلسفیانہ خیالات کو "عاقلانہ پیش گوئی" سے تعبیر کیا ہے اور میں اس سے متفق ہوں۔ اس لیے کہ اگر مصنف کے ذاتی تجربات پر منحصر ہے تو یقیناً یہ پیش گوئی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (۲) یہ ہے کہ اگر آپ کسی مصنف یا شاعر کے خیالات کی ترویج کرنا چاہتے ہیں تو اس وقت اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ اس کے اقوال کو زبان زدِ خلائق بنا دیجیے۔ یہاں تک کہ وہ روزمرہ کے ادب میں داخل ہو جائے۔ ہماری سیاسی و اخلاقی ضروریات اس کی مقتضی ہیں کہ ہم میں (IQBAL MINDEDNESS) (شعور اقبالؒ) پیدا ہو، تاکہ کم سے کم ہم اپنی سیاسیات کو اقبالؒ کی نظریات کے سانچے میں ڈھال سکیں۔ یوں تو اقبالؒ کے کلام میں صدہا اشعار اس قسم کے ہیں۔ لیکن میں نے بغرض تنوع اس سے پرہیز کیا، تاکہ ہماری زندگی کے ہر رُخ میں اقبالؒ کے خیالات مشعلِ ہدایت بنیں۔

سید یٰمین ہاشمی

کراچی، ۱۴ مارچ ۱۹۵۱ء

باب اوّل

تمہیدِ عام

خوش آں قومے پریشاں روزگارے
کہ زاید از ضمیرش پختہ کارے

نمودش سرّے از اسرارِ غیب است
ز ہر گردے بروں ناید سوارے

اس مقالہ میں پیش گوئی کے اقسام و عام اصول بیان کیے گئے ہیں۔
ذرائع پیش بینی سے بھی تفصیلی بحث کی گئی ہے اور شاعرانہ
پیش گوئی کا مشہور لیکن نادر الوجود نمونہ "پیش گوئی حضرت شاہ نعمت اللہ ولی"
بھی درج کی گئی ہے

تحلیلِ مضامین

۱۔ اسلام میں "زمان" کا تخیّل اور اس کے چار مختلف اقسام
۲۔ پیش بینی ایک فطری کیفیت ہے۔ اس کی ترقی و تنزّل کے اسباب
۳۔ پیش بینی کے حقیقی ذرائع ۔ وحی ۔ الہام
۴۔ پیش بینی کے ظنّی ذرائع اور ان کی کم مائگی ۔ نجوم کی حقیقت ۔ معتصم باللہ عباسی کا تاریخی واقعہ ۔
۵۔ شاعرانہ پیش گوئیاں "شاعری جزویست از پیغمبری" کی حقیقت ۔ شعر کی صحیح تعریف ۔ شاہ نعمت اللہ ولی کا قصیدہ اور اس کی تحلیل و حقیقت ۔

لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الاّ اللہ کا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اوّل

تمہیدِ عام

ہر نفس آوازِ عشق میرسد از چپ و راست   تا بفلک می رویم عزمِ تماشا کراست؟

چارہ روپوش ہاہست چنیں جوشہا   چشمۂ ایں نوشہا در سر و چشمِ شماست؟

(مولانا رومؒ۔ دیوان شمس تبریزؒ)

۱۔ اسلام میں "زمان" کا تخیل:

اقبالؒ کی تخیلِ "زمان" گو تمام تر قرآنی ہے لیکن علامہ مرحوم نے اپنے "مواعظ" میں اس کی تشریح کچھ ایسے دقیق انداز میں فرمائی ہے جو عوام کے فہم سے بالاتر ہے۔ اس لیے بے جا نہ ہوگا اگر میں اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر پیش کروں تاکہ مسئلہ زیرِ بحث کے سمجھنے میں آسانی و سہولت ہو۔

قرآن مجید و احادیث شریفہ میں زمانی تخیل کی توضیح چار مختلف الفاظ میں کی گئی ہے،

(۱) دہر (۲) عصر (۳) ایام اور (۴) وقت

عامی زبان میں ہر ایک دوسرے کا مرادف ہے، لیکن بغور دیکھیے تو ہر ایک زمان کی مختلف صورتیں پیش کرتا ہے:

۱۔ دہر: صحیح حدیث ہے کہ خدا فرماتا ہے۔ "تم دہر کو برا نہ کہو اس لیے کہ میں دہر ہوں۔ اس مختصر رسالہ کے صفحات اس کی مکمل توضیح کے متحمل نہیں۔ اس لیے اس قدر تشریح کافی ہوگی کہ دہر مولدِ زمان و محرکِ "کُن" ہے۔ یہ وہ سرچشمۂ تحریکِ حیات ہے جو سببِ تخلیقِ کائنات ہے۔

۲۔ عصر: سورۂ عصر (۱۰۳) میں خدا نے 'عصر' کی قسم کھائی ہے یعنی اُسے اپنی قدرتِ کاملہ کی شہادت

میں پیش فرمایا ہے جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

عصر میں زمانہ کی وہ تقسیم مشتمل ہے جو اسے ماضی و حال و
استقبال میں تقسیم کرتی ہے۔

۳۔ ایّام: تلک الایّام نداولھا بین النّاس (۳/۱۴۰) سے صاف ظاہر ہوتا ہے یہ
کے اس انقلاب کی وضاحت کرتا ہے جو بربنائے تحریکِ تاریخی (HISTORIC MOVEMENT)
محرکِ تغیر و تبدل ہے۔

۴۔ وقت، فرمایا رسول اللہ صلعم نے "میں وقت ہوں"
یہ گو خود محرکِ حیات تو نہیں، لیکن ملخصِ حیات ضرور ہے۔
لولاک لما خلقت الافلاک

یہ وہ متحرک قوت ہے جس میں زمانی و مکانی انقلابی طاقتیں مضمر ہیں اور جو خود تو انقلاباتِ عالم سے
غیر متاثر رہتی ہے لیکن حیاتِ عالم کے تغیرات پر نگران ہی نہیں بلکہ حاوی ہے۔

حیاتِ عالم کی دونوں حالتیں زمانی و مکانی اس کی ایک ایک
مُشت میں ہیں جنھیں لیے ہوئے وہ بہ سرعت تمام مقامِ محمود کی
طرف گامزن ہے۔

اس میں حدوث و قدم کا جو پُر اسرار امتزاج ہے اُس کی بابت اس سے زیادہ نہیں معلوم ہو سکا کہ

تقدیر بیک ناقہ نشانید دو محمل — سلمائے حدوث تو وہ لیلیٰ قدم را (عرفی)

۲۔ پیش بینی ایک فطری کیفیت ہے:

فطرت کی ہر نشانی ہم کو بتا رہی ہے — کچھ چیز آ رہی ہے کچھ چیز جا رہی ہے
عاقل ہے وہ جو حال و ماضی کی روشنی میں — یہ جان لے کہ کیا شے آئندہ آ رہی ہے

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس کائنات میں کتنی قوتیں ہیں، جنھوں نے حیاتِ عالم کو سہ سہ ازمنہ (ماضی و حال و

استقبال) کی ایک مضبوط زنجیر میں جکڑ رکھا ہے۔

حیاتِ عالم ایک لامتناہی زنجیر کی مانند ہے جس میں پیچ در
پیچ لاتعداد لاتحصیٰ حلقے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ کسی ایک
حلقہ پر جو گرم و سرد ایام گزر رہے ہوں، اُن سے دُوسرے
حلقے غیر متاثر رہیں۔ (جان کلف)

جان کلف کا یہ خیال تو تصویر کا نہایت عامیانہ رُخ پیش کرتا ہے۔ علامہ غزالیؒ نے مقدمہ کیمیائے سعادت میں قضا و قدر کی توضیح فرماتے ہوئے بتایا ہے کہ کس طرح احکام خداوندی عرش و کرسی سے درجہ بدرجہ نازل ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ آخری آسمان پر آکر "قدر" کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ارواح طیبات کا بآسانی گزر ہوتا ہے۔ اور انھیں بذریعہ کشف معلوم ہو جاتا ہے کہ آیندہ کیا ہونے والا ہے۔

چونکہ اسلام ایک فطری مذہب ہے (قرآن مجید ۳۰/۳۰) اور ہر بچہ مومن پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فطرت نے انسان کی جبلت میں پیش بینی ودیعت فرمائی ہے۔ قرآن مجید میں جابجا اسی فطرتِ انسانی سے اپیل کی گئی ہے۔ مثلاً

وہی خدا ہے جو جِلاتا ہے اور مارتا ہے اور اسی کے قبضۂ اقتدار
میں شب و روز کے اختلافات ہیں۔ کیا تم اتنا بھی نہیں
سمجھتے! (۸۰/۲۳)

اہل الرائے کا عقیدہ ہے کہ یہ فطری پیش بینی دنیاوی ملوثات سے کند ہو جاتی ہے۔ ورنہ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ
وہ آئینہ الوہیت جس کو زمان و مکان پر اقتدار عنایت ہوا ہے
وہ آیندہ کے واقعات سے بے خبر رہے۔

شیخ الرئیس کا خیال گو فلسفیانہ ہے لیکن اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ جیسے۔ مگر رومیؒ نے اس انعام الٰہی کا جواز

لہ ملاحظہ ہو شیخ الرئیس کی مشہور نظم مترجمہ براون (ادبیات ایران جلد دوم صفحہ ۱۱۱)

بتایا ہے اس سے زائد حقیقت آگیں توضیح ممکن نہیں۔

دو دہاں داریم گویا ہم چو نے — یک دہاں پنہانست در لبہائے وے
دمدمہ این نائی از دمہائے اوست — ہائی و ہوئے روح از ہیہائے اوست (دفتر اول)

قرآن مجید نے تو مومن کی شان یہ بتائی ہے کہ وہ آیات اللہ پر محققانہ نظریں ڈالتا ہے (۲۰/۳۰) اور جب کائنات پر موثر خانہ نگاہ سے دیکھتا ہے تو اقوام کے عروج و زوال برسوں پہلے اُسے معلوم ہو جاتے ہیں اور بد اعمالی و نیک اعمالی کے باعث جو انقلابات عالم ہوتے دکھائی دیتے ہیں اُن سے جب وہ واقف ہو جاتا ہے تو بے ساختہ پکار اُٹھتا ہے کہ

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (۳/۱۸۸)

۳۔ پیش بینی کے حقیقی ذرائع:

این درختانند ہم چو خاکیاں — دستہا برکردہ انداز خاکدان
سوی خلقاں صدا شارت می کنند — وانکہ گوشتش عبارت می کنند
نیز گوشاں راز ایشاں بشنوند — غافلاں آواز آں بشنوند (مثنوی رومی)

اللہ جل شانہٗ نے انسان کو جو قوائے فطری عنایت فرمائے ہیں وہ بہ مشکل زائل ہوتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جہل اور" صحبت طالح" اوّل قویٰ کو بہت کچھ ضعیف کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کی دبی ہوئی چنگاریاں خاکستر میں برسوں قائم رہتی ہیں اور اسی کو فلاسفہ نے "استعداد" یا صلاحیت" سے تعبیر کیا ہے۔ صلاحیت سُوء کی مثال فردوسی نے خوب دی ہے۔

درختے کہ تلخ ست دیرا سرشت — گرش در نشانی بہ باغ بہشت
دراز جوئے خلدش بہنگام آب — بہ بیخ انگبیں ریزی و شہد ناب
سرانجام گوہر بہ کار آورد — ہماں میوۂ تلخ بار آورد

یہی حال صلاحیت حسنیٰ کا ہے۔ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ انسان کی فطرت میں پیش بینی ہے۔ لیکن مادی ماحول

گردش آدمی ہے اور گردشِ جام اور ہے

غفلت آگئیں گردوپیش اس کو اگر فنا نہیں تو معطل ضرور کر دیتے ہیں ۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد صرف اسی صلاحیت فطری کو اُبھارنا ہوتا ہے اور بس ۔ اسی لیے قدرت نے انبیاء علیہم السلام میں وافر پیش بینی عنایت فرمائی ہے ۔ وہ بشیر بھی ہوتے ہیں اور نذیر بھی ۔ اگر آپ قرآن مجید کا بغور مطالعہ فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ اس منصب اعلیٰ کے انتخاب میں قدرت بڑی کاوشوں سے کام لیتی ہے ۔ یہ موقع نہیں کہ میں حاملِ وحی کی خصوصیات کا تفصیلی شمار پیش کروں، لیکن شاید اس قدر بتانا بے محل نہ ہوگا کہ یہ منصب کسبی و وہبی دونوں صلاحیتوں کے امتزاج کا نتیجہ ہوتا ہے ؎

فیضِ روح القدس ار باز مدد فرماید   دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد   (حافظ)

وحی کے بعد الہامات کا درجہ شروع ہوتا ہے ۔ ڈیوڈ بریوسٹر نے اس کی بیّن صحیح وضاحت کی ہے ۔

> انسان کے جسمانی قویٰ کو بذریعہ سائنس سمجھا جا سکتا ہے ۔ لیکن اس کے مابعد الطبعی قویٰ (جن کا تعلق اُس کے دماغ، روح اور جذبہ سے ہے) آج تک ناقابلِ فہم ہیں اور شاید رہیں گے ۔ . . . . . یہ قوتیں نہ صرف طبعیات کی دُنیا پر حاوی ہوتی ہیں بلکہ اُن سے وہ معجزات سرزد ہوتے ہیں جن کو کوئی منطق اور سائنس حل نہیں کر سکتی ۔   (انسانی قویٰ باطنیہ صفحہ ۴ ۔ ۸)

ان قویٰ کی ترقی کے اسباب کی بابت بریوسٹر نے زیادہ لطیف نکتہ بیان کیا ہے (صفحہ ۱۵)

> ظاہری علوم سے کماحقہ آراستگی کے بعد ایک جویندہ حق اپنے تفکرات کی تطہیر میں مشغول ہوتا ہے ۔ قوت متفکرہ یہاں موثرات سے پاک ہوئی تھیں کہ وہی علوم (مثلاً فلسفہ و تاریخ و شعر و شاعری) جو کبھی آتشِ طبع کے لیے حاصل کیے جاتے تھے اب جویندہ کو غیر محسوس طریقہ پر حقیقت کی طرف کھینچے لیے جاتے ہیں ۔ قدم قدم پر اس کے ایمان پختہ ہوتے ہیں، یہاں تک کہ اس کی آنکھیں وہ دیکھنے لگتی ہیں جن سے ما و شما ہمیشہ محروم رہتے ہیں ۔

حقیقی پیش بینی کی یہ دو خاص نوعیتیں ہیں، گو اگر ان کی مزید تحلیل کی جائے تو حامل وحی یا ملہم کی صلاحیتوں کے لحاظ سے مختلف شاخیں پیدا ہوں گی، مثلاً وحی نبی ہی کو لے لیجیے :

یہ کسی بشر کی طاقت نہیں کہ وہ خدا سے ہمکلام ہو، مگر اس صورت میں کہ اس پر وحی نازل ہو یا پردہ سے ہمکلام ہو یا پھر کوئی فرشتہ اس پر نازل ہو۔ (قرآن مجید ۵۱/۴۲)

حضرت یوسفؑ پر جو وحی نازل ہونے کا طریقہ تھا وہ مختلف تھا۔ حضرت موسیٰؑ پر نزول وحی کا ڈھنگ اور تھا۔ نبی آخر الزمانؐ پر ایک طریقہ تو وہ تھا جس خصوصیت میں وہ دوسرے انبیاء کے شریک وسہیم ہیں، لیکن بہ حیثیت خاتم نبوت جو ذریعہ تھا وہ سب سے نرالا تھا۔

فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنٰى ۝ فَأَوْحٰى إِلٰى عَبْدِهٖ مَا أَوْحٰى (۹-۱۱/۵۳)

پس وہ بہ فاصلہ دو کمان یا اس سے بھی کمتر تھے۔ اس وقت خدا نے اپنے بندے پر نازل فرمایا جو چاہا (تم اس راز کو نہیں سمجھ سکتے)

یہ وہ مقام ہے جہاں عبد و معبود کا فرق کمترین رہ جاتا ہے۔

میانِ عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست ۔۔۔ توخود حجابِ خودی حافظ از میان برخیز

اسی طرح (جیسا کہ محی الدین ابن العربی نے تحریر فرمایا ہے) ملہمات کی بھی ملہم کے مرتبہ کے لحاظ سے کئی قسمیں ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

۴ ۔ پیش بینی کے ظنی ذرائع :

عام طور پر سارے کے سارے ظنی علوم کو کلیتاً باطل کہنا غلطی ہے۔ اس لیے کہ ان کے ذریعہ سے جو پیش گوئیاں کی جاتی ہیں وہ کبھی صحیح بھی ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن اول تو ان کے ماہرین کم ہیں۔ دوئم ان کے جاننے والے صرف اپنے اپنے مخصوص علم سے کام لیتے ہیں اور ان ہزارہا اثرات کو نظرانداز

کر جاتے ہیں جو اُن کے نتائج کے ردِ عمل پہ مائل ہیں (رابرٹ شرپوڈ)

گو ہمارے مبحث کا یہ پہلو کچھ غیر متعلق سا ہے، لیکن صرف اس لیے کہ مضمون تشنہ نہ رہ جائے ۔ غالباً تھوڑا سا وقت اس پہ صرف کرنا بے جا نہ ہوگا ۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ فطری قوت کی (پیش بینی کے زوال کے باوجود بھی انسان میں) استعداد و صلاحیت باقی رہتی ہے ۔ لیکن وہ لوگ بھی جو اس فطری جذبۂ ہدایت سے منہ موڑتے ہیں ان کے دلوں میں بھی آئندہ واقعات کے جاننے کی زبردست خواہش موجود رہتی ہے ۔

بلکہ میرا تو یہ تجربہ ہے کہ مذہبی ذہنیت کے لوگوں میں وہ توکل پایا جاتا ہے
جس سے وہ کبھی مستقبل کے لیے متفکر نہیں رہے لیکن جن کے دل سے

کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

کے عقیدۂ زریں سے معرّا رہتے ہیں ۔ وہ تو ہر وقت اس جستجو میں رہتے ہیں کہ کل کیا ہوگا ۔

(مناظر گیلانی : صوفیان سود صفحہ ۳۳)

مگر میرا خیال ہے کہ یہ جستجوئے مستقبل صرف اس لیے نہیں ہوتی کہ ان کے اعتقادات و ایمان ضعیف ہیں بلکہ یہ اُسی فطری قوت کا تقاضا ہے جو اپنے نفس سے باہر جا کر دیگر ذرائع پیش بینی کام میں لانا چاہتی ہے ۔ اگر علامہ گیلانی کا نظریہ مان بھی لیا جائے تو اس کی توجیہہ بالفاظ بیکن یہ ہوگی کہ

بداعمال کا ضمیر ایمانی ہر وقت اپنے مستقبل سے خائف رہتا ہے اور وہ
ہر قسم کے جھوٹ سچ بہانے اپنی تسکین کے لیے تلاش کرتا رہتا ہے ۔

یہی سبب ہے کہ اس کی کاوشوں نے متعدد ظنی علوم اختراع و ایجاد کیے ۔ مثلاً رمل ۔ جفر ۔ نجوم ۔ فراست الید وغیرہ وغیرہ ۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض اوقات ان کے ذریعہ سے جو پیش گوئیاں کی جاتی ہیں وہ صحیح بھی ہوتی ہیں ۔ لیکن (جیسا کہ رابرٹ شرپوڈ کا خیال ہے) اوّل تو ان کے محقق و عالم شاذ و نادر ملتے ہیں اور دوسرے یہ کہ یہ علوم اس عالم کو من حیث المجموع نہیں دیکھتے ۔ نجومی محض سیاروں کی گردش سے نتائج اخذ کرتا ہے

اور صاحب فراست الیدصرف ہاتھ کی لکیروں سے غیب کے حالات جاننے کی کوشش کرتا ہے" مگر ان اثرات کو نظر انداز کرجاتا ہے جو اُن کے ردِّعمل پر مائل ہیں"۔ نجوم کا صحیح تخیّل ایک نجومی کی زبان سے سنیئے:

اس میں شبہ نہیں کہ ہندو دھرم میں نجوم کو مذہبی حیثیت دی گئی ہے۔ لیکن یہ اختراع برہمنوں کی ہے۔ ہندو دھرم کے علماء کا عقیدہ ہے کہ غیب کا حال پرماتما کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ سیارے بذاتہٖ موثر نہیں ہیں بلکہ کسی پُر اسرار سبب کے جو نتائج پیدا ہونے والے ہیں ان کا آئینہ ہیں یا یہ کہیے کہ اشارہ (POINTER) بتانے والے ہیں۔

اس قابل مصنّف (فرو ہارٹ شراف) نے اس کی مثال نہایت صحیح دی ہے:

اگر گھڑی تین بجا رہی ہے تو اس کے یہ معنی سمجھنا غلطی ہوگی کہ گھڑی وقت کا تعین کرتی ہے۔ گھڑی غلط بھی ہوتی ہے اور صحیح بھی۔ وقت کا تعین تو کسی اور اسباب پر مبنی ہے۔ گھڑی تو صرف اس کا آئینہ ہے یا POINTER

جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں کہ یہ "غیب دانی کے مدعی" ان اثرات سے بالکل بے خبر رہتے ہیں جو ردّ عمل پر مائل ہیں۔ منجملہ اوّل اثرات کے بعض تو اب تک نامعلوم ہیں اور بعض کم قدر، لیکن ایک مسلمان کے لیے جس سبب اہم کا جاننا ضروری ہے وہ "عزم بالجزم" ہے جسے اقبال اپنے مخصوص انداز میں "ذوقِ یقین" سے موسوم کرتے ہیں:

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

"نگاہِ مردِ مومن" تو پھر بھی بہت بڑی چیز ہے جو افسوس کہ آج مفقود ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ قوم کیا، ایک فردِ واحد کا عزمِ خالص "منجم کی تقویمِ فردا کو باطل" کردینے کے لیے کافی ہے۔ کیا آپ اس کی ایک سبق آموز مثال نہیں سنیں گے:

منجم کی تقویم فردا ہے باطل (اقبالؔ)

معتصم باللہ عباسی (۸۳۳ ـ ۸۴۷ء) کا دورِ حکومت ہے۔ رمضان المبارک (۲۲۳ ـ ۲۲۸ھ) کے دن ہیں۔ حبس، تپش و بارش کا زور ہے۔ اُس وقت ایک دن خلیفہ کے دربار میں مخبر کا عریضہ گزرا کہ ملک شام میں شہر عموریہ سے عیسائی ڈاکو ایک سیدہ ہاشمیہ حسین لڑکی کو بالجبر اُٹھا لے گئے۔ جب وہ کشاں کشاں لے جائی جا رہی تھی۔ اس نے چلّا کر کہا۔ "معتصم! تجھ پر لعنت ہو کہ تیرے عہد میں ایک سیدہ معصومہ کو کافر اٹھائے لیے جا رہے ہیں۔"

اس خبر کا سننا تھا کہ معتصم آپے سے باہر ہو کر تخت پر "لبیک، لبیک" کہتا ہوا کھڑا ہو گیا اور معاً فوج کی تیاری اور روانگی کا حکم دیا۔

وزراء نے اس عجلت کی مخالفت کی۔ اُمراء نے نامہ و پیام کا مشورہ دیا۔ سپہ سالار نے موسم کی خرابی و صعوبتِ سفر کے عذر پیش کیے اور منجمین نے قطعی حکم لگا دیا کہ اس جنگ میں ناکامی ہوگی۔

لیکن معتصم عزم و استقلال کا ہمالیہ تھا۔ اس نے قسم کھائی کہ جب تک ایک سیدہ مسلمہ کے عوض میں ایک ہزار عیسائی عورتیں گرفتار نہ کروں گا۔ آرام و نیند حرام ہے۔

فوج ظفر موج روانہ ہوئی، رومن شہنشاہ تھیا فلس کو عموریہ کے سامنے شکست ہوئی۔ ۵۵ روز کے محاصرہ کے بعد عموریہ فتح ہوا۔ مسلمانوں نے انتقام سے اپنے دل ٹھنڈے کیے اور بالآخر وہ اسیرہ لائی گئی۔ خلیفہ نے دوگانہ شکریہ ادا کیا۔ شعراء نے قصیدے پڑھے، ابن مرحمتی کا قصیدہ سب سے بڑھا چڑھا نکلا جس کا مشہور مصرعہ آج ضرب المثل ہے۔

(ترجمہ) سچ ہے۔ تلوار نجومی سے، زیادہ سچ بولتی ہے۔

یہی وہ عزم بالجزم ہے جس کی بابت علّامہ اقبال فرماتے ہیں :

یقین افراد کا سرمایۂ تعمیر ملّت ہے
یہی قوّت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملّت ہے

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ قوم کی اجتماعی کوشش کس طرح ناممکن کو ممکن ہی نہیں بلکہ کامیاب عمل بنا دیتی ہے ۔ باقی رہے " نگاہِ مردِ مومن " کے اثرات ۔ معاذ اللہ وہ تو بے پناہ ہیں ۔

اُس کے ادنےٰ اشاروں سے آگ اپنی فطرت بدل دیتی ہے ۔ سمندر خشک ہو جاتے ہیں ۔ بہرے ، گونگے سننے اور بولنے لگتے ہیں ۔ مُردے زندہ ہو جاتے ہیں اور بے جان لکڑی ذی عقل بن جاتی ہے ۔

خود چہ جائے ترک و تاجیک است و زنگ   فہم کرد است ایں ندا را چوب و سنگ
ہر دلے از وے ہمی آید الست   جوہر و اعراض می کردند مست

۵ ۔ شاعرانہ پیش گوئیاں :

شعر قدرت کے خاموش و پُر اسرار مناظر و واقعات کی وہ صدائے بازگشت ہے جو شاعر کے قلب و دماغ سے ارادتاً بہ الفاظ موزون ظاہر ہوتی ہے ۔

" شاعری جزویست از پیغمبری " کا مشہور مقولہ زبان زدِ خلائق ہے ۔ شاعری کو پیغمبری کا جزو قرار دینا قرآنی حقیقت کے خلاف ہے ۔

ہم نے اُنھیں (یعنی رسولؐ کو) شاعری نہیں سکھائی اور یہ ان کی شایانِ شان بھی نہیں ۔ (۶۹/۳۶)

جب شاعری شایانِ شان پیغمبری نہیں تو " جزو پیغمبری " کے کیا معنی ؟ محققانہ نظر سے دیکھنے کے بعد اس خیال کی تاریخ سمجھ میں آجاتی ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ ایامِ جاہلیت میں شعرائے عرب کاہن ہوتے تھے اور کاہن ہی اکثر شاعر بھی ہوتے ۔ چنانچہ پیغمبر عربیؐ پر جہاں اور الزامات تھے وہاں یہ بھی تھا کہ وہ " شاعر " ہیں ۔ ایران میں

شاعری آئی تو فن نے رُخ بدلا مضمون آرائی، فصاحت و بلاغت کی بہتات ہوئی۔ گو معرّی (متوفی ۱۰۵۷ء) اور (متوفی ۹۶۵ء) نے دعویٰ پیغمبری کیے۔ لیکن ان کے کلام کو الہامی تسلیم کرنے سے دنیا نے انکار کر دیا۔ اوّل تو ان میں کوئی پیش گویانہ خصوصیات نہ تھیں۔ دوئم بالمقابل قرآن وہ یا وہ و ہرزہ سے بہتر نہ تھے۔ سلاجقہ (گیارھویں صدی) کے زمانہ میں فارسی شاعری کو عروج ہوا۔ شعراء میں فصاحت و بلاغت کا شوق پیدا ہوا۔

قرآن فصاحت و بلاغت میں مشہور تھا۔ اس لیے شعراء نے از راہِ مبالغہ اس محدود و مخصوص خصوصیت (فصاحت و بلاغت) میں شاعرانہ فصاحت کو جزو پیغمبری قرار دیا۔ یہ تو اس خیال اور اس مقولہ کی حقیقت ہے۔ گو شاعری کو پیغمبری سے دُور کا واسطہ بھی نہیں، اس لیے کہ پیغمبر حامل وحیِ آسمانی ہوتا ہے جس میں کذب و افترا کو ذرّہ برابر دخل نہیں، لیکن شاعری بالخصوص حقیقی شاعری، اُس "فکرِ ظاہر" سے ضرور قریبی تعلق رکھتی ہے جو تزکیۂ نفس کے بعد وہ دِقّت نظر پیدا کرتی ہے جس میں مستقبل بہ آسانی نظر آتا ہے۔

یوں تو شعر و شاعری کی تعریفات سے مغربی و مشرقی ادبیات مالا مال ہیں۔ لیکن اگر شعر کی رسمی و ظاہری خصوصیات کو نظر انداز کر دیا جائے تو محض یقین ہے کہ قارئین میری تعریف کو پسند کریں گے۔

شعر قدرت کے خاموش و پُراسرار مناظر و واقعات کی وہ صدائے بازگشت

ہے جو شاعر کے قلب و دماغ سے ارادتاً بہ الفاظ موزوں ظاہر ہوتی ہے۔

یہ تعریف ہماری ساری مشکلات کو حل کر دیتی ہے۔ اوّل تو یہ ان یاوہ گویوں کو شعرا کی فہرست سے خارج کر دیتی ہے "جن کی جاہلانہ ہرزہ سرائی" (بقول ڈاکٹر ڈبنی راس) "اور بہتات زوال قومی کا پیش خیمہ ہے۔" دوئم ماخذ شاعری کی بھی تعیّن کرتی ہے اور پھر اس کے استفادی خصوصیات پر بھی زور دیتی ہے اور آخر میں

ملاحظہ ہو،

ل؎ اگر شاعری معنی میں جدت پیدا کرے اور الفاظ میں خوبی و سلاست اور مضمون کی بندش بھی اچھی کرے اور دوسروں سے اختصار الفاظ پر بھی زیادہ قادر ہو اور معانی کے رُخ کو اِدھر سے اُدھر بھی پھیر سکے۔ اُس حالت میں ہم سے مجازاً تو شاعر ضرور کہا جا سکتا ہے" (ابن رشیق، متوفی ۱۰۷۰ء) مگر شاعری اس سے ماوراء ہے۔

یہی وہ تعریف ہے جس کے ذریعہ سے آپ ان مفکرین کو زمرۂ شعرا میں شامل کر سکتے ہیں جنھوں نے پیرایۂ شاعری صرف اس لیے اختیار کیا ہے تاکہ ان کی کرخت حقیقت میں لحنِ داؤدی کی سی نرمی اور موسیقی پیدا ہو جائے۔

حسب ذیل مشہور نظم دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ یہ شاہ نعمت اللہ ولی کرمانی (متوفی ۱۴۳۱ء) سے منسوب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ نظم نہ صرف ۱۸۵۷ء کے غدر کے خاص اسباب میں تھی۔ بلکہ اس سے قبل بیشتر افغانستان و ایران و وسط ایشیا میں اس کے باعث زبردست فسادات و انقلابات ہوئے۔ چونکہ اس کی عبارت بے حد آسان ہے۔ اس لیے بغیر ترجمہ اس کے دلچسپ و منتخب اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔ پھر بھی حاشیہ پر نوٹ دے دیے گئے ہیں۔

۱	قدرتِ کردگار می بینم[1]	حالتِ روزگار می بینم
۲	از نجوم این سخن نمی گویم[2]	بلکہ از کردگار می بینم
۳	در خراسان و ہند و شام و عراق	فتنہ و کارزار می بینم
۴	ظلمتِ ظلمِ ظالمانِ دیار[3]	بے حد و بے شمار می بینم
۵	جنگ و آشوب و فتنہ و بیداد	از یمین و یسار[4] می بینم
۶	بندہ را خواجہ وش ہمی بینم	خواجہ را بندہ وار می بینم[5]
۷	ہر یک از حاکمانِ ہفت اقلیم	دیگرے را دوچار[6] می بینم
۸	ماہ را روسیاہ می بینم[7]	مہر را دلفگار می بینم[8]
۹	ترک و تاجیک[9] را بہمدگر[10]	خصمے دلگیر و دار می بینم

[1] میں دیکھ رہا ہوں [2] یہ منجمانہ پیش گوئی نہیں بلکہ یہ باتیں خدا کی جانب سے دکھائی جا رہی ہیں [3] ملک [4] دائیں بائیں یعنی ہر چہار طرف [5] جو غلام تھے وہ آقا بن گئے اور جو آقا تھے وہ غلام دکھائی دے رہے ہیں [6] ایک دوسرے سے جنگ آزما [7] چندر گرہن [8] سورج گرہن [9] عرب [10] آپس میں دشمن و جنگ آزما

نمود ہر شے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

۱۰	مکر و تزویر[11] و حیلۂ بسیار	از صغار و کبار[12] می بینم
۱۱	حالِ ہندو خراب می بینم	جورِ ترک و تتار می بینم
۱۲	اندکے امن اگر بود آں ہم	در حدِ کوہسار می بینم
۱۳	گرچہ می بینم ایں ہمہ غمہا	شادیٔ غمگسار[13] می بینم
۱۴	بعد امسال چند سالِ دگر	عالمے چوں نگار[14] می بینم
۱۵	عاصیاں از امامِ معصوم[15]	خجل و شرمسار می بینم
۱۶	برکفِ دست ساقیٔ وحدت[16]	بادۂ خوشگوار می بینم
۱۷	غازیِ دوستدارِ دشمن کش	ہمدم دیارِ یار می بینم
۱۸	زینتِ شرع و رونقِ اسلام	ہر یکے را دوبار[17] می بینم
۱۹	گرگ با میش و شیر با آہو[18]	در چرا برقرار می بینم
۲۰	ترک عیار[19] مست می نگرم	خصم او در خمار می بینم
۲۱	نعمت اللہ نشستہ در کنجے	از ہمہ برکنار[20] می بینم

محققین کا خیال ہے کہ اس نظم میں برابر الحاقی شعر ملائے گئے ہیں۔ چنانچہ خود مطبوعہ نسخہ (ایران جلد ۳ صفحہ ۴۶۷) سے میں نے یہ نظم نقل کی ہے۔ اس میں مقطع کے بعد تیرہ اشعار مزید درج ہیں۔ جن میں سے چند قابلِ نقل ہیں:

[11] فریب [12] چھوٹے بڑے یعنی تمام لوگ [13] معشوق [14] یعنی اہل تشیع میں بدکار لوگ [15] مبلغ وحدتِ الٰہیہ کے ہاتھوں میں عمدہ و اعلیٰ پیام اسلام ہوگا [16] دوبارہ [17] ضرب المثل یعنی جیسے شیر و بکری دونوں ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں [18] چالاک [19] اس کا دشمن زبوں حال ہوگا [20] سب سے الگ۔

نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے

۱	چوں زمستان پنجمیں بگذشت	ششمش خوش بہار می بینم
۲	نائب مہدی آشکار شود	بلکہ من آشکار می بینم
۳	بادشاہے تمام دانائے	سرورے باوقار می بینم
۴	بندگانِ جنابِ حضرتِ او	سربسر تاجدار می بینم
۵	تا چہل سال اے برادر من	دور آں شہریار می بینم
۶	دور او چوں شود تمام بکام	پسرش یادگار می بینم
۷	بعد ازاں خود امام خواہد بود	کہ جہاں را مدار می بینم
۸	میم، حا، میم، دال میخوانم	نام آں نامدار می بینم
۹	ید بیضا کہ باد پاینده	باز با ذوالفقار می بینم
۱۰	مہدیِ وقت و عیسیِ دوراں	ہر دو را شہسوار می بینم
۱۱	گلشن شرع راہمی بوئم	گل دین را بہار می بینم

اس مشہور تاریخی نظم کی تحلیل و تشریح بے جا نہ ہوگی۔ اس لیے کہ اس نے متعدد انقلابات پیدا کیے اور لاکھوں جانیں ضائع کرائیں [۱۰]

۱ تا ۱۲، اشعار تک شاعر مستقبل قریب کے فتنہ و فساد کی پیش گوئی کرتا ہے۔ جس میں ترک و عرب (شعر ۱۹) کی جنگی پیش گوئی خاص کر قابلِ لحاظ ہے۔ ترکوں اور عربوں میں سب سے پہلی آویزش ۱۵۱۷ء میں

---

[۱] جاڑہ [۲] چھٹا [۳] بلکہ مجھے اس قدر اُس کے طور کا یقین ہے کہ میں اسے ظاہر دیکھ رہا ہوں [۴] مرکز [۵] محمدؐ [۶] اشارہ طرف معجزہ حضرت موسےٰ جس میں حضرت کو "سپید ہتھیلی" بطور معجزہ دی گئی تھی۔ دراصل "دین مبین" جو پاینده (ہمیشہ) رہے گا [۷] نام شمشیر حضرت علیؓ [۸] سونگھ رہا ہوں [۹] پھل دار دیکھ رہا ہوں [۱۰] میرا خیال یہ ہے کہ یہ نظم تمام تر جعلی ہے اور حضرت ولی کی تصنیف ہی نہیں۔ اس کے تفصیلی وجوہ کے یہ صفحات حامل نہیں۔

ہوئی۔ جب سلطان سلیم اوّل نے ممالک مصر سے عرب چھینا۔ پھر قریب ڈھائی صدی بعد ترکوں کو عبدالوہاب نجدی سے (۱۸۱۱ء) سے جنگ کرنی پڑی۔ ان میں تیسری اور آخری جنگ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۷ء تک ہوئی جب عرب ترکوں سے بالکل آزاد ہو گیا۔

۱۳ تا ۲۱، اشعار تک شاعر مسلمانوں کی ترقی کی پیش گوئی کرتا ہے۔ جس میں گو شیعانِ علی کو ہزیمت ہوگی۔ لیکن اسلام کو بالجملہ رونق ہوگی۔

الحاقی اشعار میں غالباً صفویہ کے عروج کی پیش گوئی ہے (شعر ۲) لیکن افسوس کہ ہم ان میں سے کسی کو بھی چالیس سال تک (شعر ۵) حکمران نہیں پاتے۔ ممکن ہے کہ یہ پیش گوئی ظہور مہدیؑ و عیسیٰؑ سے قبل واقع ہو (اشعار ۱۰)

یہ پیش گوئیاں واقعی شاہ ولی کی ہیں یا نہیں؟ اس سوال کے علاوہ یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ اُس تاریخی شاعرانہ پیش گوئیوں کے زمرہ میں آتی ہیں جو "تطہیر فکر" کے بعد شاعر کی بصیرت افروز آنکھیں مستقبل میں دیکھتی ہیں۔ گو مصنف کا دعویٰ ہے کہ ؎

از نجوم ایں سخن نمی گویم بلکہ از کردگار می بینم

لیکن ساری نظم پڑھ ڈالیے۔ کسی ایک شعر سے بھی وہ مخلصانہ و مفکرانہ و مؤرخانہ دقتِ نظر کا پتہ نہیں چلتا جو ہمیں اقبالؒ کی پیش گوئیوں میں جابجا نظر آتی ہیں۔ آئیے اب اُن پر اجمالی نظر ڈالیں۔

باب دوم
تمہیدِ خاص

آوازۂ حق آتا ہے کب اور کدھر سے
مسکین و کم مانده دریں کشمکش اند

اِس مقالہ میں اقبالؒ کی پیش گوئیوں سے عام بحث کی گئی ہے۔ اقبالؒ کا نظریۂ شاعری کی عامیانہ بحث پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے اقبالؒ کی روحِ شاعری پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اُن کی مُورّخانہ ذہنیت اور ذرائعِ حقیقت بینی کو نئے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اقبالؒ کی پیش گوئیوں کا پس منظر دکھایا گیا ہے اور آخر میں اقبالؒ کی پیش گوئی کی انوکھی خصوصیت "عزم بالجزم" بتائی گئی ہے۔

"اقبالؒ کی شاعرانہ پیشگوئیوں پر ایک اجمالی نظر"

تحلیل مضامین

۱۔ اقبالؒ کا نظریۂ شاعری۔ ابن رشیق کے مطابق شعراء کی قسمیں۔
اقبالؒ کا خیال۔

۲۔ اقبالؒ کی رُوحِ شاعری۔ مؤرخانہ حقیقت بینی۔ تاریخ و مؤرخ
(محمد رسول اللہ صلعم) کی تاریخ لکھنی ناممکن ہے۔ سیروا فی الارض کے
معنی۔ ذرائع حقیقت بینی۔ اقبالؒ کی سوانح حیات کا ایک پہلو۔

۳۔ اقبالؒ کی پیشگوئیاں اور اُن کا پس منظر۔ "پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت"
کی تردید بقول نپولین شاعری کی دو قسمیں۔ "تطہیر فکر"

۴۔ علاّمہ اقبالؒ کی پیش گوئیوں کی انوکھی خصوصیت۔ عزم بالجزم۔
سچے قائد کی تعریف۔

باب دوم

تمہید خاص

اقبال کی شاعرانہ پیشگوئیوں پر ایک اجمالی نظر

"قلب" ایک جبلّی فطرت ہے یا پھر اندرونی توجہ جو (رومی کے حسین الفاظ میں) آفتاب کی کرنوں سے اپنی غذا حاصل کرتی ہے اور اس طرح ہمیں حقیقت کے ان پہلوؤں سے آشنا کرتی ہے جو قویٰ حسیّہ کے دائرے سے باہر ہیں۔ بفحوای قرآن یہ "دیکھتی ہے" اور اس کی اطلاعات (اگر ان کی صحیح ترجمانی کی جائے) کبھی بھی غلط نہیں ثابت ہوتیں۔ (لیکچرس صفحہ ۱۶)

پس نخستین بایدش تطہیر فکر　　بعد ازاں آساں شود تعمیر فکر

وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے　　زمانہ کے سمندر سے نکالے گوہرِ فردا

۱۔ اقبالؒ کا نظریۂ شاعری،

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات　　نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ　　(اقبالؒ)

ارسطو (متوفی ۳۲۲ ق م) مشہور عالم یونانی فلسفی پہلا شخص ہے جس نے شاعری کے لوازم سے بحث کی ہے۔ اس کے نزدیک "جدتِ تخیل" شاعری کا جزوِ اعظم ہے۔ ابن رشیق (متوفی ۱۰۷۰ء) نے اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ گو اس کی رائے ہے کہ جن کے کلام اس خصوصیت سے عاری ہیں وہ بھی شاعر کہے جا سکتے

ہیں۔اس نے شعراء کو پانچ گروہوں میں تقسیم کیا ہے:۔

۱۔ متشدق ۔ جن کے کلام میں صرف شکوہ الفاظ ہوتا ہے اور بس۔

۲۔ متقعر ۔ جو اختراع معنوی اور تجدید لفظی کے قائل ہیں۔

۳۔ متفنی ۔ جن کا کلام خصوصیات معنوی و لفظی ۔ سے بالکل عاری ہوتا ہے۔

۴۔ متعمم ۔ جن کے کلام میں اختراع معنوی و تجدید لفظی کے علاوہ شوکتِ الفاظ بھی پائی جاتی ہے۔

۵۔ قفقغ ۔ جو معانی کو الفاظ پہ ترجیح دیتے ہیں۔

ناشی (متوفی ۹۰۶ء) شوکت الفاظ کو شاعری کے منافی سمجھتا ہے۔وہ شعر میں اس بے ساختگی کو جزو لازم سمجھتا ہے جس کی اہمیت سب سے پہلے دربار نبوی کے شاعر حسان بن ثابت نے سمجھی تھی اور جس کا تقریباً لفظی ترجمہ غالب مرحوم نے کیا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ابن خلدون (متوفی ۱۴۰۶ء) الفاظ کو معنی پہ ترجیح دیتا ہے۔

مغربی شعراء میں بھی یہ مسئلہ نہایت مختلف فیہ ہے ۔میں صرف پندار (متوفی ۴۴۳ ق م) کی رائے کے نقل کرنے پر اکتفا کروں گا :

شاعری کا جزو اعظم نہ اس کے باریک و لطیف خیالات ہیں اور نہ اُس کے خوبصورت اور پُرشکوہ الفاظ ہیں۔بلکہ وہ مخلصانہ اور پاک جذبات ہیں جو دل سے نکلتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ کا نظریہ پندار کے نظریہ سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے:

حق اگر سوزے ندارد حکمت است
شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے

علّامہ اقبالؒ ع "ہر چند کہ ایجاد معانی ہے خداداد" کے قائل ہیں لیکن وہ اس کے بھی معتقد ہیں کہ شاعر اپنے کلام حکیمانہ خیالات کا آئینہ بنا سکتا ہے اور اس وقت ع اپنی فطرت سے بھی بالا تر پہنچ جاتا ہے وہ "چغتائی البم" کے پیش لفظ میں فرماتے ہیں:

ایک قوم کی روحانی صحت بیشتر الہام کی نوعیت پر منحصر ہے جو اس کے صنّاع و شاعر حاصل کرتے ہیں۔ لیکن الہام کبھی نہیں ہوتا، بلکہ یہ تو ایک عطیّہ ہے جس کے حصول سے پہلے صنّاع و شاعر کو اس کی نوعیّت کے امتحانُ تنقید کا موقع میسّر نہیں ہوتا۔ یہ بغیر دعوت آتا ہے۔ بغرض مجالست اس سبب سے محصّل کی شخصیّت اور وصفِ حیات یہ دونوں نہایت اہم ہیں۔

اسی مضمون کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

کسی بدمذاق کا واحد الہامی خیال (اگر اس نے عوام کو اپنی طرف مائل کر لیا ہے) اٹیلا اور چنگیز کی افواج سے زیادہ نقصان رساں ہو۔
فی زمانہ مفکرین فطرت سے الہامات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن فطرت تو موجودات کا جزو ہے جو تلاش حقیقت میں ہر طرح مانع آتی ہے اور یہ تو صاحب فن کو صرف اپنے نفس ہی کے اندر مل سکتی ہے۔

علّامہ اقبالؒ کی عظمتِ خیال کا اس سے اندازہ فرمائیے کہ اس کی عین قرآنی نص سے تائید ہوتی ہے۔

زمین پر صاحبِ یقین کے لیے خدا کی نشانیاں ہیں۔ نیز تمہارے نفوس میں جنھیں تم دیکھ نہیں سکتے۔ (۵۱/۱۰-۱)

سہ
حسن را از خود بروں جستن خطاست ... آنچہ می بایست پیش ما کجاست

اگر ہم "وحی" کو لغوی معنی میں لیں جیسا کہ عطار (متوفی ۱۲۲۹ء) نے سمجھا ہے۔

وحی چہ بود ہر آنچہ در دلِ تو ... سر زند از نتائج اسرار

(ترجمہ، وحی کیا ہے؟ یہ وہ کشفِ راز ہے جو تمہارے دل پہ القاء ہوتا ہے۔

تو اقبالؒ کی تعریف سے اتفاق کرنا پڑے گا۔

وہ شعر کہ پیامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

جبریلؑ کا منصب بیداریٔ روح ہے اور اسرافیلؑ نشأۃ ثانیہ کے مجتی ہیں۔

اس نکتہ کو اگر آپ ذہن نشین رکھیں تو ہمارا دوسرا مبحث بہ آسانی سمجھ میں آجائے گا۔

۲۔ اقبالؒ کی رُوحِ شاعری:

دلم بدوش و نگاہم بہ عبرتِ امروز — شہیدِ جلوۂ فردا و تازہ آئینم

مَیں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ — میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو (اقبالؒ)

گزشتہ شمارہ میں آپ نے اقبالؒ کا نظریۂ شاعری ملاحظہ فرمایا۔ اوّل تو اقبالؒ کی شاعری کے اس پہلو کی توضیح ایک مضمونِ پارینہ ہے جو آپ کو اکثر متعلمانِ اقبالؒ کے مقالوں میں ملے گی۔ علاوہ بریں اقبالؒ کا نظریۂ شاعری نہ تو اچھوتا ہے اور نہ اس میں کوئی مخصوص ندرت۔ "شاعری" ایسے پامال مبحث پر ارسطو سے لے کر پٹر آن تک نے نہایت تحصیل حاصل بحث کی ہے اور اُن میں سے اکثر اساتذہ کے پیش کردہ نظریات قریب قریب وہی ہیں جو اقبال کا ہے۔ پھر میں عرض کر چکا ہوں کہ اقبالؒ کا نظریہ تمام تر نصِ قرآنی سے متاثر ہے اور وہ آیت کریمہ بھی پیش کر دی گئی ہے۔

اقبالؒ کی اصل عظمت اُن کی روحِ شاعری میں ہے اور چونکہ یہ شاید پہلی بار دنیا کے سامنے پیش کی جارہی ہے، اس لیے محتاجِ توضیح و تشریح بھی ہے اور لائقِ اعتناء بھی۔" اقبالؒ کی روحِ شاعری کیا ہے؟" اس کے جوابِ شافی کے لیے اس مختصر رسالہ کے صفحات کافی نہیں۔ اس لیے بالاختصار عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

اقبالؒ کی رُوحِ شاعری ہے۔ "مورّخانہ[۱] حقیقت بینی[۲]" خط کشیدہ الفاظ کے شمارہ سے آپ اس کو

بآسانی دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلے تو یہ بیان کرنے کی کوشش کروں گا کہ تاریخ کیا ہے اور مورخ کسے کہتے ہیں۔ اور پھر یہ عرض کروں گا کہ مورخانہ حقیقت بینی کی کیا نوعیت ہے؟

۱۔ تاریخ و مورخ:۔

سر زند از ماضیِ تو حالِ تو — خیزد از حالِ تو استقبالِ تو
مشکن ار خواہی حیات لازوال — رشتۂ ماضی ز استقبال و حال (اقبال[7])

مغرب نے آج فلسفۂ تاریخ کو ایک مستقل علم تسلیم کیا ہے۔ ابن خلدون نے صدہا سال قبل اس علم پہ نہایت دقیق بحث کی ہے۔ لیکن ابن خلدون سے بھی صدہا سال پہلے قرآن نے اس کو علم نہیں بلکہ مخزن علم قرار دیا ہے۔ علامہ اقبال[7] نے مخزن یا سرچشمۂ علم کی تین قسمیں بتائی ہیں۔ النفس و آفاق و تاریخ۔ آپ کا خیال ہے کہ ازروئے قرآن انہیں سے علوم حقیقی حاصل کیے جا سکتے ہیں[1]۔ لیکن اگر آپ بغور دیکھیں تو اس تقسیم کی ضرورت نہیں رہتی۔ جب ہم تاریخ کو سب پر حاوی پاتے ہیں۔

اسلام۔ مورخ کو واقعہ نویس سے بالکل مختلف قرار دیتا ہے۔ ایک واقعہ نویس یا سوانح نگار (بشرطیکہ وہ اپنے فرائض کو صحیح طور پر سمجھتا ہے) واقعات کو بالترتیب لکھتا ہے اور آگے پیچھے کے اسباب و نتائج سے بھی بحث کرتا ہے۔ لیکن مورخ کے فرائض مشکل تریں ہیں۔ وہ واقعہ کی یا شخص معلوم کی اہمیت کے لحاظ سے زمانۂ ماقبل و زمانۂ مابعد کو دور تک چھان ڈالتا ہے اور چونکہ مشکل سے دنیا میں کسی سبب کو سببِ اولین کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے اس کے مطالعہ کی وسعت ہمیشہ بڑھتی جاتی ہے۔

میں اس نکتہ کی بہترین مثال میں محمد الرسول اللہ صلعم کی ذات مبارک کو پیش کروں گا۔ آج تقریباً ہر زبان میں متعدد سوانح نبویؐ دستیاب ہیں، لیکن ان میں سے ایک بھی "تاریخ محمد الرسول اللہ" کے نام سے موسوم نہیں کی جا سکتی۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی اور تعجب نہیں کہ یا تو آپ کو غصہ آئے یا اُسے میری مبالغہ آمیزی سمجھیں۔ لیکن امید ہے کہ میری توضیحات پہ غور کرنے کے بعد آپ کو میری رائے سے اتفاق ہوگا۔

---

[1] تاریخ قرآنی ایام اللہ (۱۳/۵) ازروئے قرآن مجید تیسرا منبع علم ہے۔" (لکچر صفحہ ۱۲۸)

ذوقِ جدّت سے ہے ترکیبِ مزاجِ روزگار

یہ عام تاریخی اصول ہے کہ جس قدر اہم تاریخی شخصیت ہوتی ہے اسی قدر وسیع زمانہ قبل کا مطالعہ اس روح تاریخی کو سمجھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے جس کی تحریک سے وہ ہستی معرضِ وجود میں آتی - بحمد اللہ آپ کو نبی آخر الزماںؐ کی تاریخی حقیقت سمجھنے کے لیے کسی شاعرانہ خوش اعتقادی کو دخل نہیں دینا پڑے گا - بلکہ آپ کے ہاتھ میں اسنادِ نصوص ہوں گی اور دوسری طرف سندِ عقل - اب اسی ترتیب سے انہیں ملاحظہ فرمائیے:

۱ - وہ زمانہ جس سے تحریکِ تخلیقِ محمدی ہوتی -	۲ - وہ زمانۂ آخر میں جب تک روحِ محمدی کی انتہائی ترقی کی خبر ہیں دی گئی ہے -
۲ - اگر تم نہ ہوتے تو میں اس فضائے عالم کو پیدا نہ کرتا (حدیث صحیح)	۲ - ممکن ہے کہ تمہارا رب تمہیں مقام محمود کی بلندی عطا فرمائے (۱۷/۷۹ قرآن مجید)

پہلا زمانہ اگر ازل نہیں تو ازل سے قریب ہے - اس لیے کہ جب آپ کی خاطر یہ عالم وجود میں آیا تو بالیقین روحِ عالم (کُن) میں اور نورِ محمدیؐ میں کوئی خاص تعلق ہے ورنہ یہ حدیث بے معنی ہو جاتی ہے اور اسی طرح دوسرا دَور اگر ابد نہیں تو ابد سے قریب تر ہے - اس لیے کہ یہ منصب بعد قیامت و بعد حشر و نشر و بعد جنت ہی ممکن ہو سکتا ہے - اس رسالے کے صفحات اس غیر معمولی حقیقت کی توضیح کے متحمل نہیں - میرا مقصد یہ بتانا ہے کہ مورّخ اگر وہ واقعتاً اپنا فرض ادا کرنا چاہتا ہے تو اسے اس تولیدی و انقلابی تحریک کا مطالعہ کرنا پڑے گا جس میں انفس و آفاق دونوں شامل ہیں - آپ نے مورّخ کی مشکلات کا اندازہ فرمایا - آپ اب خود بتائیں کہ آج تک کسی نے بھی تاریخ محمدیؐ تصنیف کی ؟ میرا خیال ہے کہ یہ انسانی بضاعت علم سے باہر ہے -
ممکن ہے کہ آپ فرمائیں کہ جب مورّخانہ حقیقت بینی اس درجہ مشکل ہے تو پھر "سیروا فی الارض" کی جا بجا تاکید کیوں ہے ؟ اگر صنعت "سوال و جواب ذہنی" کو کام میں لاؤں گا تو کہوں گا ؏

آپ نے بات چھین لی منہ کی

واقعہ نویس سے تو صاحب سیرت بھی ارفع و اعلیٰ ہوتا ہے - آج کل کے "واقعہ نویس" دشت احقاف میں جاتے ہیں - گزوں زمین کھود کر آثارِ قدیمہ نکال لیتے ہیں اور پھر ارم کی تاریخ مرتب کرتے ہیں اور بتاتے ہیں "ذات العماد"

کون تھے اور ان کی تہذیب وتمدن کیا تھی اور کس طرح اور کن حالتوں میں فنا ہو گئے ۔ اگر مقصد صرف یہی ہوتا ہے تو "سیر" کی بجائے "سفر" کی تاکید ہوتی ۔ صاحبِ سیرت اُن قریبی اسباب وعلل سے بحث کرتا ہے جنھوں نے انہیں دوشِ عالم پر ایک بارگراں بنادیا تھا ۔ صاحبِ سیرت کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اُن اسباب میں انھیں جدا کردے جن سے قوم "ضالین" میں تو شامل ہو جاتی ہے لیکن "مغضوبین" میں شامل نہیں ہوتی ۔ پھر ان اسباب پر بحث کرے جن کے باعث وہ مغضوب بن کر عذابِ الٰہی کی مستحق قرار پائیں ۔

اس دلچسپ بحث کو ایک مختصر لیکن عام مثال دے کر ختم کروں گا ۔

آج کل عام طور پر تاریخ میں زوال "وعروج" ہند کے اسباب میں (۱) مرہٹوں اور سکھوں کا خروج اور (۲) انگریز آنجہانی کا عروج پڑھایا جاتا ہے لیکن یہ تو اسباب نہ ہوئے ۔ یہ تو سلطنت کی کمزوری کے نتائج تھے ۔ سبب تو یہ تھا کہ سلاطین نے غیر اسلامی طرز معاشرت وحکومت اختیار کی اس لئے **تباہ ہوئے ۔ مؤخر الذکر سیرت** ہے اور اوّل الذکر واقعہ نویسی ۔

میں اپنا وعدہ بھولا نہیں ہوں کہ سرکار دو عالم صلعم کے مورخ حیات کو عقلی طور پر بھی یہ لازم ہے، کہ وہ ابتدائے عالم سے انتہائے عالم تک کے حالات واثرات کا زائچہ لے ۔ میں اس لطیف حقیقت کا ثبوت ہیں چند لفظوں میں پیش کروں گا ۔

یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ کسی حقیقت کا بہترین معیار "عقل" ہے ۔ آپ ابتدائے آفرینش سے ۱۶۰۰ء تک جتنے بھی عقلاء ۔ بانیٔ مذہب ۔ انبیاء ورشی مُنی گزرے ہیں سب کے اقوال واسناد وتصنیف [illegible] لیکن کسی میں بھی آپ کو کسی مسئلہ کے ثبوت میں "عقل" سے اپیل نہیں ملے گی ۔ واقعہ یہ ہے [illegible] نبوی سے قبل عقل انسانی پختہ ہی نہ تھی ۔ اس لئے اُس سے " افلا تعقلون " کہنا بے [illegible] ہوتا ۔ ایسی حالت میں مورخ حیاتِ محمدی تمامی ذرائع ثبوت (جبر ۔ تقلید ۔ مثال ۔ توہمات ۔ غیر منطقی دلائل وغیرہ وغیرہ) اور اعتقاد پر غور کرتا ہوا ساتویں صدی میں پہنچے گا ۔ لیکن اس کا فرض یہاں ختم نہیں ہوتا ۔ اس لئے کہ اب اسے عقل کی مختلف قسموں کو جانچنا پڑے گا ۔ استدلالی واستنباطی دلائل میں امتیاز کرنا پڑے گا ۔ پھر "عقل سلیم" (قرآن ۲۶۹/۲) کو جانچے گا

اور اس کی متعدد لو عیتوں کو دیکھے گا۔ غرض عقل انسانی اس محیر العقل ہستی کے سمجھنے سے بھی قاصر ہے اور قاصر رہے گی۔

اس قدر طویل لیکن مفید بحث کے بعد آپ بآسانی علاّمہ اقبالؒ کے مندرجہ عنوان اشعار کو سمجھ جائیں گے۔ کہ موصوف نے "تاریخ" اور اگر یہ آپ کی بضاعت سے باہر ہے! تو پھر سیرت کی تعلیم کیوں ضروری قرار دی ہے۔ میرے لیے گزشتہ معروضات کی تکرار ضروری نہیں جس میں مَیں نے بتایا ہے کہ یہ زمانہ کس طرح مثل ایک طویل زنجیر کے سال و قرن کے چھوٹے چھوٹے حلقے رکھتا ہے۔ ایک قوم کا ماضی و حال و استقبال سب ایک بہت بڑی زنجیر میں منسلک ہے۔ اہل سیرت گزشتہ واقعات کے عبرت انگیز حصّوں سے فائدہ اٹھاتا ہے اور ان کی روشنی میں "حال" کو دیکھتا ہے۔ پھر حال کے موثرات کا رجحان دیکھتا ہے اور اس سے مستقبل کا اندازہ کرتا ہے۔ اقبالؒ کا قلب صافی علوم کا خزینہ تھا۔ لیکن چونکہ میں تاریخ کو سرچشمۂ علوم سمجھتا ہوں اس لیے یہ عرض کروں گا کہ اقبالؒ فی الواقع مورخ ہیں اور ان کا یہ دعویٰ محتاجِ دلیل نہیں۔

دلم بدوش و نگاہم بہ عبرتِ امروز　　　شہید جلوہ و فردا و تازہ آئینم

مگر اُن کے ذرائع "حقیقت بینی" کسی قدر توضیح کے محتاج ہیں۔

۲۔ ذرائع حقیقت بینی،

خوش آں قومے پریشاں روزگارے　　　کہ زاید از ضمیرش پختہ کارے

نمودش سّرے از اسرار غیب است　　　زہر گردے برون ناید سوارے　　　(اقبالؒ)

گزشتہ شمارہ کو اگر آپ نے بغور ملاحظہ فرمالیا ہے تو پھر اس مبحث کے سمجھنے میں دقت نہ ہوگی۔ صوفیائے کرام نے جو ذرائع حقیقت بینی قرار دیے ہیں ان میں مخصوص وظائف۔ ترک حیوانات و چلّہ کشی وغیرہ وغیرہ سے آپ کے کان آشنا ہوں گے۔ میں نہ اس کا معتقد ہوں اور نہ منکر۔

مئے نشاط کو لب تک نہ لے گیا ہو جو　　　خمار و نشہ میں وہ امتیاز کیا جانے

مگر ہاں اتنا جانتا ہوں کہ صدہا میل دُور سے "یا ساریہ! الجبل! الجبل!!" کہنے والے نے نہ تو کبھی چلّہ کھینچا

تھا اور نہ کسی ورود وظائف کے عادی تھے ۔ علامہ اقبالؒ کا خیال ہے اور صحیح خیال ہے کہ ع

جہانبانی سے بھی دشوار تر کارِ جہاں بینی

لیکن ذات بابرکات کی طرف اشارہ ہے ۔ اس میں " جہانبانی و بینی " دونوں اس مکمل حد تک مجتمع تھیں کہ

بنی اسرائیل میں ایسے آدمی تھے جن سے مکالمہ (الہیّہ) ہوا کرتا تھا ۔

بغیر اس کے کہ وہ نبی ہوں ۔ اگر کوئی میری اُمت میں ایسا ہے تو وہ عمرؓ

ہے ۔ (بخاری کتاب فضائل اصحاب)

اس لیے معلوم ہوا کہ وہ قوت جس کی بناء پر کسی کو یہ دعویٰ ہو وہ اور ہی طرح پیدا ہوتی ہے

مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے (اقبالؒ)

تزکیہ نفس کے لیے ایک ارادت مند کو دو منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے اور ہر ایک منزل میں متعدد مقامات

ہیں پہلی منزل میں تو اُسے اس دنیا سے محترز ہونا پڑتا ہے جس کی تعریف رومی نے اس طرح کی ہے ۔

چیست دُنیا از خدا غافل بودن
نے معاش و سیم و زر فرزند و زن

علامہ موصوف کے سوانح حیات شاہد ہیں کہ کبھی انہوں نے والیانِ ملک اور امراء کی منّت کا بوجھ اپنی

گردن پر نہیں ٹھہرنے دیا ۔ صدقِ مقال و اکلِ حلال ان کا مسلک تھا ۔ سیاسی میدان سے صرف اس لیے جُدا

رہے کہ وہ اس کے " مرد " نہ تھے ۔

الحدیث

دوسری منزل زیادہ کٹھن ہے اور شاید یہ وہی ہے جس کی بابت حدیث شریف نے رجعنا

الی الجہاد الاکبر من الجہاد الاصغر فرمایا ہے ۔ نفس کے خلاف جنگ بڑی مشکل چیز ہے ۔ مگر جس نے اوّلین منزل

ختم کی خدا اُسے منزل مقصود تک پہنچا ہی دیتا ہے ۔ اس منزل کے رہرو صادق کی میں نے تو صرف ایک

شناخت قائم کی ہے ، وہ کس حد تک سنتِ براہیمیؑ کا متبع ہو کر قولاً و فعلاً اس کا مدعی ہے ۔

دیدۂ بینا میں داغِ غم چراغِ سینہ ہے

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ لا

میری نماز و ذبح و زندگی و موت سب عالم کے پالنے والے کے لیے ہے

آپ کے دعوتِ محبت الٰہی کا امتحان بقول شاعر نظم "ابوبن ادہم" صرف اس سے ہوگا کہ آپ کو اُس کے قانون اور اس کے مذہب اور اس مذہب کے نام لینے والوں سے کتنی محبت ہے۔ غالباً میں مطلق مبالغہ سے کام نہیں لے رہا ہوں۔ اگر یہ کہوں کہ علامہ اقبالؒ کو مسلمانوں کی منفعت کا بزبان قرآنی ہو کیا (حرص) تھا۔

ایک غم یعنی غم ملت ہمیشہ تازہ ہے (اقبالؒ)

ایسے محبِ اُمت پر تجلیات بن بلائے آتی ہیں:

نگہ پیدا کر اے غافل تجلی عین فطرت ہے
کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا (اقبالؒ)

اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں جو بصیرت پیدا ہوتی ہے وہ اس گوشہ نشین راہب کی بصیرت کی مانند نہیں ہوتی جو صرف خود کو دیکھتا ہے اور بس۔ بلکہ وہ دوسروں کو چشم بصیرت عطا کرتا ہے۔

خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اِس لیے کہ محبتِ اُمت کے بعد محبتِ صاحب اُمت پیدا ہو جاتی ہے اور یہی ملکوتیت ہے۔

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی (اقبالؒ)

اس نوبت پر پہنچ کر "محبت اُمت" کے جذبات بے قابو ہو کر پھوٹ نکلتے ہیں اور وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا اور کس طرح ادا کر رہا ہے ؎

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

اور ایسی ہستی اگر خوش قسمتی سے شاعر ہی ہوئی تو اس کا پیام موسیقی و عکاسی دونوں کا بہترین مجموعہ بن جاتا ہے۔ ایک طرف تو وہ پہلے اپنی گفتار میں درد کی دھندلی سی تصویر لیتا ہے۔ "پھر اس کو اپنی شوخی گفتار

سے واضح کرتا ہے۔ پھر اُس میں وہ "محیّ نشاۃ" اجزا شامل کرتا ہے جس سے اس کا لحن داؤدی مُردوں کو زندہ کر دیتا ہے ؎

سونے والوں کو جگا دوں شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلا دوں شعلۂ آواز سے

۳۔ اقبالؒ کی پیشگوئیاں اور اُس کا پس منظر۔

گفتا کہ ہر چہ در دلت آید ز ما بخواہ — گفتم کہ بے حجابیٔ تقدیر ہم از دست
از روزگارِ خویش ندانم جز ایں قدر — خوابم ز یاد رفتہ و تعبیرم از دست (اقبالؒ)

تمہید خاص میں اقبالؒ کا نظریۂ شاعری آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ بعد ازاں اقبالؒ کی اردو شاعری کے تحت میں ان کی مورخانہ حقیقت بینی پر تحصیل حاصل بحث نظروں سے گزری۔ اب میں آپ کے سامنے اس مبحث کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ سے گزشتہ مباحث کی روشنی اقبال کی پیشگوئیوں کا ایک سرسری سا تعارف ہو جائے جو تمہید کا اصل مقصد ہے۔

حضرت علیؓ کا قول ہے کہ میری وجہ سے دو گروہ جہنم میں جائیں گے۔ ایک تو وہ جو میری تعریف حد سے زیادہ کرتا ہے۔ اور مجھ سے وہ صفات منسوب کرتا ہے جس سے میں عاری ہوں۔ دوسرا وہ جو میری ان صفات کا بھی منکر ہے جن سے اللہ جل شانہٗ نے مجھے متصف فرمایا ہے۔ قرآن مجید نے مسلمانوں کو امت وسطیٰ کا جو گرانقدر لقب عطا فرمایا ہے وہ نہایت معنی خیز ہے جس کی تشریح و توضیح میں صفحات کے صفحات رنگین کیے جا سکتے ہیں۔ بالاجمال یہ توضیح کافی ہوگی کہ کسی کی خوبیاں ہوں یا برائیاں اُسی حد تک کرنی چاہئیں جو اس میں موجود ہوں۔ یہی وہ افراط و تفریط تھی جس نے یہودیوں کو مغضوبین میں اور عیسائیوں کو ضالین میں شامل کر دیا ہے۔ بعض معتقدینِ اقبالؒ اپنے جوش میں اس درجہ غلو کے مرتکب ہوتے ہیں کہ وہ اقبالؒ کو پیغمبری کے درجہ پر پہنچا دیتے ہیں۔

در دیدۂ معنی نگراں حضرت اقبالؒ — پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت[1]

[1] اس کے جواز کی سند "ہست قرآں در زبانِ پہلوی" سے لینا غلطی ہے۔ اس لیے کہ لا محالہ مثنوی رومی تفسیر ہے قرآنی بزبان پہلوی

"پیغمبری کردن" بھی بہت بڑا منصب ہے۔ نہ میرا مذہب نہ میری عقل سلیم کبھی بھی اس حد تک علامہ موصوف کی تعریف کرنا مناسب سمجھتی ہے۔ علامہ اقبالؒ دنیائے اسلام کے ایک مایۂ ناز مفکرین میں ہیں۔ علم و تبحر اور خلوصِ محبت اُمت نے آپ کے دل و دماغ کو ایسا پاک و صاف بنا دیا تھا کہ آپ اس دعویٰ کے صحیح طور پر مجاز ہیں۔ ؎

دیکھتا ہوں دوش کے آئینہ میں فردا کو مَیں

یہ نگاہ حقیقت میں وہ عطیہ خداوندی ہے جو بہت کم نفوس کو عطا ہوتا ہے۔ علامہ میں اس خصوصیت کی ہم جس قدر بھی تعریف کریں اس کے واقعتاً مستحق ہیں۔

اگر آپ اقبالؒ کے سوانحِ حیات کو بغور ملاحظہ فرمائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے آپ کو بچپن اور جوانی ہی سے ایک مفکرانہ ذہنیت عطا فرائی تھی۔ ہندوستان میں جب تک تعلیم حاصل کرتے رہے محققین کی صحبت سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ یورپ تشریف لے گئے تو وہاں بھی عام مغرب زدہ ہندوستانی طلباء کی طرح وہاں کی تہذیب و تمدن سے مرعوب نہ ہوئے۔ بنیاد چونکہ خالص اسلامی تھی اور بحدہٖ علوم اسلامیہ سے مالا مال تھے اس لیے مغربی طرزِ زندگی و معاشرت سے نفرت پیدا ہو گئی۔ پیش گویانہ طرز میں فرماتے ہیں،

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

یورپ سے واپسی کے بعد اقبالؒ کا دورِ تصنیف و تالیف شروع ہوتا ہے۔ شاعری سے ابتدا ہوتی ہے لیکن وہ بازاری شاعری نہیں جو تمام تر مخربُ الاخلاق ہے بلکہ وہ فنِ شریف جسے ایک محقق بطور پیرایہ عرض اس لیے اختیار کرتا ہے تاکہ اس کا حق آگین پیام منظوم صورت میں اپنی تلخی کم کر دے یا پھر بقول نومین

"شاعری کی دو قسمیں ہیں۔ اوّل وہ جو نفسیاتی خواہشات کی ترجمان ہوتی ہے۔
میں تو کبھی کسی کو یہ مشورہ نہ دوں گا کہ اس میں اپنا وقت ضائع کرے۔ لیکن
اگر جوشِ شباب جذبات میں ایسا ہیجان پیدا کر ہی دے جس پر قابو پانا مشکل
ہو جائے تو پھر آپ کچھ ضرور لکھیئے۔ لیکن اسے صرف اپنے جذبات کی تسکین

کے لیے خلوت میں پڑھ لیجئے۔ اس لیے کہ ایسے کلام کی اشاعت دوسروں کو بھی آپ ہی جیسا شاعر بنا دے گی۔ ممکن ہے آپ کو اپنے جذبات پر قابو پانے کا موقع مل جائے۔ لیکن دوسروں کو نہ ملے۔ اس وقت ان کی تباہی کی ذمہ داری آپ کے سر ہوگی۔

ظاہر ہے کہ علامہ اقبال کی شاعری کبھی بھی پہلی صنف میں نہیں آتی۔ آگے چل کر مؤتین نے اس شاعری کی حقیقت بیان کی ہے جو اقبالؒ کی شاعری پر بالکل چسپاں ہوتی ہے۔

دوسری قسم کی شاعری متفکرانہ قوتوں کے اس جوش کا اظہار کرتی ہے جو اس مادی گرد و پیش سے دور اُڑ کر اسرارِ کائنات سے واقف ہو جانا چاہتی ہے اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کی شاعری ہر کس و ناکس سے ممکن نہیں لیکن شعر گوئی کوئی فرض نہیں جسے آپ ضرور ادا کریں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

علامہ اقبالؒ نے اس مفید شاعری کے حصول کے چند ذرائع بیان فرمائے ہیں۔ آپ کا عقیدہ ہے کہ اس کے لیے سب سے پہلے "تطہیرِ فکر" ضروری ہے۔

پس نخستیں بایدش تطہیرِ فکر
بعد ازاں آساں شود تعمیرِ فکر

"تطہیرِ فکر" تقریباً وہی ہے جسے عام طور پر "تزکیۂ نفس" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کی ضروری تفصیل عرض کی جا چکی ہے۔ "تعمیرِ فکر" میں وہی "مؤرخانہ حقیقت بینی" ہے۔ جس کی بابت بھی میں آپ کی کافی سمع خراشی کر چکا ہوں۔ لیکن اس نوبت پر اس قدر عرض کر دینا ضروری ہے کہ "تعمیرِ فکر" کا عام اسلوب کیا ہے جسے علامہ اقبالؒ نے اختیار کیا اور جسے وہ اپنے دعویٰ ع

پردہ برگیرم بے پردہ سخن می گویم

کی شہادت میں پیش کرتے ہیں۔ آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل جس حقیقت کو قرآن مجید نے بتایا تھا۔

پستیٔ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم

پس ہم تمہاری آنکھوں سے پردے ہٹا دیں گے یہاں تک کہ تم
کو زمانہ کی آہنی حقیقت معلوم ہو جائے گی (۵۰/۲۲/۲۳)

اُسے فی زمانہ محققین نے تسلیم کر لیا ہے کہ طبیعیاتی و مابعدالطبیعیاتی فرق روز بروز اس طور پہ کم ہو رہے ہیں کہ مؤخرالذکر کا دائرہ ہر وقت کم ہو رہا ہے۔ اور وہ حقیقت جو کل مابعدالطبیعیاتی سمجھی جاتی تھی وہ آج علم طبیعیات میں شامل ہے۔ علامہ اقبال غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس قرآنی حقیقت کو واضح کیا ہے اور ہماری نظروں میں ان کی عظمت کی انتہا نہیں رہتی۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ اس حقیقت کو اپنی پیش گویانہ قوت کی انکسارانہ تاویل میں پیش کرتے ہیں:

بہ پایاں چوں رسد ایں عالم پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر

مگر علامہ خواہ اس عطیہ الٰہی کی کم حقیقتی کتنی ہی ظاہر کریں لیکن ہم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ یہ ہر شخص کو حاصل ہو سکتی ہے۔ ع "تا نہ بخشد خدائے بخشندہ"۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک (۱) انفس (۲) آفاق (۳) تاریخ۔ تین ذرائع علم ہیں۔ یہاں یہ موقع نہیں کہ میں ان کے مشہور نظریہ خودی کی توضیح کروں۔ لیکن اس قدر عرض کرنا ضروری ہے کہ "ذریعہ انفس" میں خودی کی ترقی بھی شامل ہے۔

غلامِ ہمت آں خود پرستم   کہ با نورِ خودی بیند خدا را

اسی خودی کی نمو اعلیٰ انسان کو پیغمبری تک پہنچا دیتی ہے۔ مگر وہ لوگ جو اس اعلیٰ مقام پر نہیں بھی پہنچ سکے ان کی آنکھوں سے بھی پردے اٹھ جاتے ہیں اور انھیں وہ نظر آتا ہے جسے ہم نہیں دیکھ سکتے۔

ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار   وہی مہدی وہی آخر زمانی

علامہ مرحوم کے ذرائع علم کو زیر نظر رکھتے ہوئے ان کی پیش گوئیوں کے دائرے بھی بآسانی سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ جن کی میں نے حسب ذیل تقسیم کی ہے:-

(۱) پیش گوئی بابت مذہب اسلامیہ (۲) پیش گوئی بابت ملتِ اسلامیہ (۳) متفرقات

آپ کی پیش گوئیوں کا لبِ لباب یہ ہے کہ

آنچہ بودست و نباید زمیاں خواہد رفت
آنچہ بایست و نبود است، ہماں خواہد بود

اسلام کے مستقبل کی بابت جو پیش گوئیاں ہیں وہ ہماری خاص توجہ کی مستحق ہیں۔

ہوچکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

۴۔ علامہ اقبالؒ کی پیشگوئیوں کی انوکھی خصوصیت:

عزم بالجزم

علامہ اقبال کی سب سے نمایاں خصوصیت بہ حیثیت پیشگو یہ ہے کہ وہ صرف کسی آئندہ واقعہ کی خبر ہی نہیں دیتے بلکہ اس کی تکمیل کے لیے ہمہ تن عزم بالجزم بھی رکھتے ہیں اور اس صوفی وسادھو کی طرح نہیں جو مراقبہ کے بعد معیّن یا غیر معیّن و مبہم الفاظ میں چند جملے آئندہ کی بابت کہہ دیتا ہے اور یہ بھی سچی قیادت کی نشانی ہے۔ ان کی مشہور نظم بعنوان "ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا" اُس عزم کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ جس کی تمامی منازل اقبالؒ نے اپنی زندہ مثال سے قوم کے سامنے پیش کر دی۔

اقبالؒ کا خیال ہے (اور صحیح خیال ہے) کہ

> عام مسلمان جذبۂ قربانی و ایثار سے معرّا نہیں خصوصاً اگر انہیں آئندہ کے مقصود و مقدمہ کا صحیح اندازہ ہو جائے۔ موجودہ واقعات اس کے شاہد ہیں۔ اگر قصور ہے تو ہمارا یعنی قائدین کا، قوم کی قیادت آزادانہ انداز میں کبھی پیش نہیں کی جاتی جس کا لازمی نتیجہ تصادم ہے۔ بعض وقت تو نازک مواقع پر خود جماعت کے اندر یہ صورت پیدا ہوتی ہے (تقریرات صفحہ ۵۶)

مسلمانانِ عالم میں عموماً اور مسلمانانِ ہند میں خصوصاً مخلص لیڈروں کے فقدان پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

(.....) کا یہ خیال صحیح ہے کہ مسلم جماعت نے سچے لیڈر نہیں پیدا کیے۔ "لیڈر" سے میری
مراد ایسے اشخاص سے ہے جو خداداد عطیہ (عقل) و تجربات کی بنا پر اسلام کی حقیقتِ
مقصود کے احساس کے ساتھ ساتھ اسی قدر تاریخی رجحانات سے مالا مال بھی ہوں۔

اب اگر اس معیار پر ہم اپنے لیڈروں کو جانچتے ہیں تو ہماری مایوسی کی انتہا نہیں رہتی۔ الا ماشاء اللہ عقل ہے تو قلب سلیم (۴/۸/۳۷) نہیں تجربات ہیں تو غیر اسلامی نظام سلطنت کے' اور اول تو تاریخ اسلامی کے حقائق سے ناواقف' اور اگر کالج کے کورس میں کچھ پڑھ لیا ہے تو اسی قدر کہ بس اس کا جواب دے سکیں ؎

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے   شہر قیصر کا جو تھا اس کو کیا سَر کس نے؟

علامہ اقبالؒ نے مذکورہ نظم میں "روشن ضمیر" لیڈر کے لیے چند ضروریات بتائی ہیں جس کی وہ خود زندہ مثال تھے رومی "سِرِ دلبر در حدیثِ دیگر" کے قائل تھے لیکن اقبالؒ کا پیرایۂ سخن "سِرِ درویش در ذکرِ خویش" پر مبنی ہے؛

(۱) اول تو یہ کہ وہ چشمِ بصیرت رکھتا ہو' ظاہر ہے کہ یہ غیر اسلامی زندگی بسر کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
تجھے بھی صورتِ آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا

(۲) یہ کہ دردآشنا ہو اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مدعی قیادت عوام کی ضروریات و مصائب سے واقف نہ ہو' اور یہ واقفیت اسی وقت ممکن ہے۔ جب وہ عوام کے ساتھ اُنہی کی سی زندگی بسر کرے۔ محلوں میں رہنے والے ان کا حال کیا سمجھیں جن کے جھونپڑے بے سقف و دَر ہیں [1]

---

[1] امراء کی غرباء کے حالات سے ناواقفیت و بے پروائی کا بہترین واقعہ لوئس یازدہم شاہ فرانس کا ہے کہ جب قحط سے مخلوقِ خدا تڑپ رہی تھی اور صدہا انسان ہر گھنٹے مر رہے تھے تب اس ظالم نے اپنے وزیر سے پوچھا کہ کیا عوام خورد و نوش سے اس درجہ مجبور ہیں کہ انھیں کیک بھی میسر نہیں آتا؟

(۳) لیکن یہ ہمدردی موجودہ لیڈرانِ قوم کی طرح الفاظی پلیٹ فارم اور پریس تک ہی محدود نہ ہو بلکہ بموجب آیۂ کریمہ حریص علیکم بالمومنین رؤف الرحیم کا[1] اسوۂ حسنہ لیے ہوئے ہو

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کرکے چھوڑوں گا — لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کرکے چھوڑوں گا

مگر غنچہ کی صورت ہوں دلِ دردآشنا پیدا — چمن میں مشتِ خاک اپنی پریشاں کرکے چھوڑوں گا

(۴) موجودہ لیڈرانِ قومی کا اصول تو بقول اکبر مرحوم " غرض یہ ہے ڈنر ہو، اک جتھا ہو اور چندہ ہو" لیکن قائد روشن ضمیر کا مقصد واحد قومی اتحاد ہوتا ہے - وہ پارٹی بازی نہیں کرتا بلکہ شیرازہ پریشاں کو متحد کرتا ہے۔

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو — جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کرکے چھوڑوں گا

جب یہ سب ہو لیتا ہے تب اس کا یہ دعویٰ صحیح ہوتا ہے کہ "میں داغ محبت کو نمایاں کرکے چھوڑوں گا"۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اقبال "صرف" ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظرِ فردا " لیڈر کی طرح خوش آیند خواب نہیں دیکھتے بلکہ اس خواب کو حقیقت آگیں بنانے کے لیے "شغلِ سینہ کاوی" میں بھی مصروف ہیں۔ پھر ایسی کی ہوئی پیش گوئیاں کیوں نہ صحیح ہوں ۔ ع

جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں!

---

[1] رسول اللہ کو مسلمانوں کی بھلائی کا ہوکا ہے اور وہ بے حد صاحب رافت ورحمت ہیں (قرآن ۱۲۸/۹)

باب سوم

حیاتِ عالم

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

اس مقالہ میں علّامہ اقبالؒ کی وہ پیش گوئیاں مع توضیحات درج ہیں جو آپ نے حیاتِ عالم کی بابت فرمائی ہیں۔ ایک مسلمان مفکر کے لیے علّامہ مرحوم کا یہ سوال ضرور لائقِ اعتناء ہے

مجھ کو تو یہ دُنیا نظر آتی ہے دگرگوں
معلوم نہیں دیکھتی ہے تیری نظر کیا؟

تحلیل مضامین

۱۔ تخلیق عالم کا سبب اصلی، خداوند عالم و حضرت داؤد کا مکالمہ۔ رومیؒ و اقبالؒ کے خیالات کا موازنہ۔ کیبل (KEBEL) کا نظریہ قرآنی "کالانعام"

۲۔ انقلاب روزگار کی حقیقت، برگسان کا عقیدہ۔ آیۃ کریمہ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ کی تفسیر۔ لزروئے قرآن دونوں کے انقلابات۔ ایک تیسری قسم کا انقلاب اور اس کی حقیقت۔ حضرت عمرؓ کے عہد کے دو واقعات۔ علامہ اقبالؒ کی خودی۔

۳۔ زندگی کا مستقبل، تنازع للبقاء، علامہ اقبالؒ کے خیالات بابت تنازع للبقاء۔ آپ کا مخصوص فلسفہ انقلاب۔ "انسان اشرف المخلوقات نہیں" (قرآن) جہنم و جنت کی زندگی۔ جنت میں کشمکش احسن۔

باب سوم

حیاتِ عالم

زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگر است (اقبالؒ)

ا۔ تخلیقِ عالم کا سبب اصلی:

عشق از لذتِ دیدار سراپا نظر است
حسن مشتاق نمود است و عیاں خواہد بود (اقبالؒ)

رومیؒ نے اپنے مجموعہ غزلیات موسومہ "دیوان شمس تبریزؒ" میں خداوند عالم اور حضرت داؤدؑ کا مکالمہ نہایت دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا۔ سوال تھا کہ خداوندا تجھے آخر کیا حاجت تھی کہ تو نے اس عالم کو پیدا کیا؟ ارشاد ہوتا ہے:

میں ایک گنج نہاں تھا۔ نمودِ حسن کا اقتضا ہے۔ جب میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں، تب میں نے اس عالم کو پیدا کیا۔ (حدیث)

ایسی حالت میں ایک فلسفی کو اس سوال کا حق پیدا ہوتا ہے کہ ع
حسن اگر قدیم ہے، عشق قدیم کیوں نہ ہو؟

علامہ اقبالؒ "موت و فنا" کو ہم معنی نہیں سمجھتے۔

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "تجدید مذاق" کا آخر یہ ہیبت ناک طریقہ کیوں اختیار کیا گیا؟

رومیؒ کا خیال ہے۔

ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند
اوّل آن بنیاد را ویراں کنند

اقبالؒ نے اسی مضمون کو زیادہ شاعرانہ پیرایہ میں بیان فرمایا ہے:۔

زندگی کا شعلہ اس دانے ہیں جو مستور ہے
خود نمائی خود فزائی کے لیے مجبور ہے

رومیؒ اور اقبالؒ میں صرف یہ فرق ہے کہ اوّل الذکر تعمیر حیات کو کسی اور کے ہاتھوں میں دے دیتے ہیں۔ لیکن اقبالؒ "خود" "موتی" کے ہاتھوں میں چھوڑ دیتے ہیں۔ فرق بظاہر عظیم ہے۔ لیکن اگر بغور دیکھئے تو دونوں نے دو مختلف انسانوں کی موت کو پیش نظر رکھا ہے۔ رومیؒ عام ممات کا ذکر کرتے ہیں۔ بالخصوص زوال قومی کا جہان خرابہ کے انہدام کے بعد ہی تعمیر ممکن ہوتی ہے۔ لیکن اقبالؒ ان چند نفوس کی موت کو پیش نظر رکھتے ہیں جن کی زندگی و موت سب خدا کے لیے ہوتی ہے (۶/۱۶۳) اور جو محمد رسول اللہ صلعم کی طرح صحبتِ محبوب کو حیات دنیاوی پر ترجیح دیتے ہیں۔

خرّم آں روز کزیں منزلِ ویراں بروم
راحتِ جاں طلبم وز پئے جاناں بروم (حافظ)

میری اس توضیح کی تائید خود اقبالؒ کے ان اشعار سے ہوتی ہے جو اسی نظم میں پائے جاتے ہیں مثلاً

پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ

لیکن ان دو کے علاوہ تیسری قسم کی جانیں بھی ہیں۔ جن کی بابت قرآن کا حکم ہے کہ وہ بلا حساب کتاب جہنم میں ڈال دی جائیں گی بقول کیبل؛

اُن کی مثال اس چراگاہ کی ہے جسے ایک کسان خزاں کے لیے محفوظ

کرلیتا ہے تاکہ اس کے مویشی اس سے چارہ حاصل کریں۔

قرآن مجید انھیں جانور نہیں بلکہ جانور سے بدتر سمجھتا ہے (۷/۱۷۹)

فطرتِ ہستی شہیدِ آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو (اقبالؒ)

مشہور عالم فلسفی برگسان کا عقیدہ ہے کہ اس حیاتِ عالم میں دو مختلف مجموعے قوتوں کے برسرِ کار ہیں۔ ایک مجموعہ کا تو یہ عالم ہے کہ اس کی ہر قوت آپس میں موالات و اتحاد پر آمادہ نظر آتی ہے اور دوسری قوت کی کارفرمائی کے لیے وہ ہر ممکن قربانی بھی کردیتی ہے۔ لیکن دوسرے مجموعے میں ہر قوت دوسری قوت سے دست و گریباں ہے اور اگر کبھی ان میں اتحادِ عمل بھی نظر آیا تو محض تخریبی۔ آگے چل کر کہتا ہے کہ

یہ دونوں مجموعے خود اپنی اپنی جگہ ہر وقت ایک دوسرے سے جنگ آزما رہتے ہیں۔ بنظرِ غائر تسلیم کرنا پڑے گا کہ عموماً فتح تخریبی ہی قوی کو ہوتی ہے لیکن کوئی غیر محسوس قوت حق کو ہمیشہ کے لیے فنا ہونے سے بچا لیتی ہے۔

یہ وہ جنگ ہے جو انقلابِ روزگار کی ذمہ دار ہے۔

صوفیائے کرام اس انقلاب کی سیدھی سادی توجیہہ میں آیۂ کریمہ پیش کرتے ہیں۔

کل یوم ھو فی شان

ہر وقت خدا اپنی نئی شان سے جلوہ فرما ہے (ترجمہ)

لیکن میں دونوں میں کوئی نقیض نہیں پاتا۔ وہ قوت جو حق کو فنا ہونے سے بچا لیتی ہے وہ وہی شانِ خداوندی ہے جو ہر آن نئی قوتوں میں نمودار ہوتی رہتی ہے ؎

ہر زمانے میں دگرگوں ہے طبیعت اس کی
کبھی شمشیرِ محمدؐ ہے، کبھی ضربِ کلیمؑ

قرآن کریم دو نوع کے انقلابات کی خبر دیتا ہے؛

(۱) اوّل وہ جو تاریخی تحریک پر مبنی ہیں یا ہوتے ہیں۔ تاریخی تحریک کیا ہے اور اس سے انقلابات کیوں کر رونما ہوتے ہیں؟ یہ نہایت ہی تفصیلی بحث کا محتاج ہے۔ جو نہ صرف ہمارے مبحث سے خارج ہے بلکہ اس رسالہ کے صفحات اس کے متحمل نہیں۔ فرقانِ پاک اس کی طرف نہایت معنی خیز اشارہ فرما کر ساکت ہو جاتا ہے:

تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (۳/۳۹)

(ترجمہ) یہ زمانہ کا اُلٹ پھیر ہے جو یکے بعد دیگرے افراد و قوم میں دائر رہتا ہے۔

(۲) دوسری قسم کا انقلاب جس کی طرف بار بار اشارے ہیں وہ تغیرات ہیں جو معصیت کے باعث پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

کلام پاک کو بغور مطالعہ فرمائیے تو بین السطور سے ایک تیسری قسم کے انقلاب کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یہ وہ حوادث روزگار ہیں جو قحط۔ وبا۔ قتل و غارت و زلزلہ وغیرہ کی صورت میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ محققین کا عقیدہ ہے یہ اول و دوم دونوں کے مجموعی اثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ جو بھی ہو ایک مفکر کے لیے یہ سوال رہ جاتا ہے کہ آیا ان پر قابو پایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ آئیے اس نکتے کے جواب کے لیے قرآن و حدیث دونوں سے فائدہ اٹھائیں:

اور کیوں نہ کوئی قریہ ہوا جس کے ایمان لانے نے اُسے بچا لیا ہوتا بجز قوم یونسؑ کے کہ جب وہ ایمان لائے تب ہم نے اُن سے ذلت کا عذاب ہٹا لیا۔ (سورہ یونسؑ۔ آیۃ ۹۸)

معلوم ہوا کہ دعا سے یہ حوادث ٹل سکتے ہیں۔ حدیث شریف بھی اس کی تائید کرتی ہے۔

دُعا سے بلائیں ٹلتی ہیں اور زکوٰۃ سے قضا ٹلتی ہے۔ (حدیث)

دوسری مثال کے لیے حضرت عمرؓ کا دَورِ خلافت ملاحظہ فرمائیے۔ فاروق اعظمؓ کے رتبہ عالی کا اندازہ ان احادیث سے فرمائیے:

۱۔ اگر مُہر نبوت ختم نہ ہوتی تو میرے بعد عمرؓ نبی ہوتے۔

انسان کی ہر قوت سرگرم تقاضا ہے

۲۔ اُمّت موسوی میں بعض انبیاء سے خدا کلام فرماتا تھا۔ میری اُمّت
میں ایسی ذات عمرؓ کی ہے۔

قدرت کاملہ نے آپ کو حوادث پر اس درجہ قابو عنایت فرمایا تھا کہ
ایک دن حضرت عمرؓ اپنا دُرّہ ہاتھ میں لیے مدینہ کی گلیوں میں جا رہے
تھے کہ دفعتہً زلزلہ آیا۔ معاً آپ نے زمین پر کوڑا مار کر فرمایا:
"ٹھہر جا! کیا میں نے تجھ پر انصاف نہیں کیا ہے"
اور زمین ٹھہر گئی۔ (صحیح حدیث)

لیکن ایسی ذاتِ بابرکات کے عہد میں بھی عربستان میں ہولناک قحط واقع ہوا۔ جس کی عسرت کو بہت حد تک آپ کی دعاؤں نے دفع کیا۔

علاّمہ اقبالؒ نے انقلاب عالم کے اسباب اور اس کے طریقۂ اندفاع پر بہت کم بحث کی ہے۔ لیکن جو کچھ فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا قلب زمانہ سے بے چین تھا۔ چونکہ علاّمہ مرحوم ترکِ خودی کو سارے مصائب کی جڑ سمجھتے ہیں اور دعا کو اظہارِ خودی کا ایک مؤثر ذریعہ۔ اس لیے ان کی رائے فی زمانہ قابل اعتناء ہے:

مجھ کو تو یہ دنیا نظر آتی ہے دگرگوں — معلوم نہیں دیکھتی ہے تیری نظر کیا
ہر سینہ میں اک صبحِ قیامت ہے نمودار — افکار جوانوں کے ہوئے زیر و زبر کیا
ممکن نہیں تخلیقِ خودی خانقہوں سے
اس شعلۂ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر کیا؟

مفکرین مغرب کی طرح اقبالؒ "فکری انقلاب" کو تمامی انقلاب کی بنیاد سمجھتے ہیں اور آپ کے نزدیک انقلابِ مستقبل کا صحیح پتہ اگر چل سکتا ہے تو اقوام کے افکار ہی سے چل سکتا ہے۔ آج جب کہ
ع ہر قوم کے افکار میں پیدا ہے تلاطم" پھر اس سے زیادہ اس آنے والے تغیرات کا کیا ثبوت چاہیئے؟

۳۔ زندگی کا مستقبل:

زندگی جوئے رواں ست و رواں خواہد بود
ایں مئے کہنہ جواں ست و جواں خواہد بود
(اقبالؒ)

ایک طرف تو ہمیں سلسلہ اسباب تخلیق یہ بتایا جاتا ہے کہ

حسن مشتاق نمود است و عیاں خواہد بود

دوسری طرف ہمیں قیامت کی ہولناک تصویریں بھی دکھائی جاتی ہیں اور حشر و نشر و دوزخ و جنّت کے مناظر بھی دکھائے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر "حیات مابعد (LIFE) کا حشر کیا ہوگا اور کب ہوگا؟

ایک نامعلوم مصنف 'تنازع للبقاء' کی تشریح لکھتا ہے:

"اس دنیا میں اگر کوئی حقیقت ناقابل انکار ہے تو وہ تنازع للبقاء ہے۔ بادی النظر میں تو معلوم ہوتا ہے کہ طاقتور کمزور کو کھائے جا رہا ہے لیکن اگر بغور دیکھئے تو ہر طاقتور کمزور کو کھا کر، کمزور ہو رہا ہے۔ کیا ہمارے سامنے ایسی مثالیں نہیں ہیں جب کہ صدہا سال کی خاموش ظلم رسیدہ قومیں آناً فاناً قوی بن کر، انھیں جو کل تک قوی سمجھے جاتے تھے چشم زدن میں فنا کر دیتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ نزاع بقا بھی کسی تیسری طاقت کا ایک ہتھکنڈہ ہے جو نظام حیات کے لیے ہر وقت استعمال ہوتا رہتا ہے۔"

علامہ اقبالؒ اسی قسم کے تنازع کے قائل ہیں۔ اُن کے نزدیک مضبوط کمزور کو نہیں فنا کر رہا ہے ع "زندگی در پئے تعمیر جہانِ دگر است" اور اُس جہان کے لیے جن قوی کو فطرت ضروری سمجھتی ہے۔

آنچہ بود است و نباید زمیاں خواہد رفت
آنچہ بایست و نبود است ہماں خود بود

ہے ترے امروز سے نا آشنا فردا ترا

(ترجمہ) جو شے ضروری نہیں وہ مٹ جائے گی اور جو ضروری ہے وہ ہو کر رہے گی

اس حد تک تو آپ کو علامہ اقبال رح کے نظریہ میں کوئی ندرت نظر نہ آئے گی۔ اس لیے کہ تنازع للبقاء عام عقیدہ ہے۔ جو محتاج ثبوت نہیں۔ لیکن علامہ موصوف کا ایک خاص فلسفۂ انقلاب ہے جو ایک طرف قرآنی ہے اور دوسری طرف نہایت دقیق اور لاثانی۔

شاید یہ حقیقت آپ پہلی بار سن رہے ہوں گے۔ اس لیے کہ میری نظروں سے کوئی اسلامی تصنیف ایسی نہیں گزری جس میں انسان کو اشرف المخلوقات نہ بنایا گیا ہو بہ استثناء چند جن کا ذکر آگے آتا ہے۔ قرآن مجید اس حقیقت کو واضح کرتا ہے۔

اور بیشک ہم نے بنی آدم کو سربلند کیا، زمین و سمندر پر انھیں اٹھان اٹھائی انھیں ہم نے اچھی چیزوں میں سے بھی عنایت کیا اور ہم نے انھیں اپنی بیشتر مخلوقات پر فضیلت دی۔ (بنی اسرائیل آیۃ ۷۰)

معلوم ہوا کہ انسان کو بیشتر مخلوقات پر تو ضرور فضیلت دی ہے لیکن تمامی پر نہیں۔ اور جن پر فضیلت نہیں عطا ہوئی ہے وہ ایک سے زیادہ ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا وہ مخلوق موجود ہے یا بعد میں پیدا کی جائے گی۔ اگر موجود نہیں ہے تو اس حالت میں انسان کو موجودہ مخلوقات میں ضرور اشرف المخلوقات کہا جاسکتا ہے[1]

اقبال رح بھی اسی کے قائل ہیں۔ ان کی مشہور نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" سے ضروری اشعار نقل ہیں:

ختم ہو جائے گا لیکن امتحاں کا دور بھی	ہے پس نہ پردۂ گردوں ابھی دور اور بھی
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات	عام اس کو یوں نہ کر دیتا نظامِ کائنات
موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے	خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں	آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

[1] ملاحظہ ہو مثلاً آیۃ کریمہ ۶/۸ جہاں "میں نے ...... کو عالمین پر فضیلت دی" بلا استثناء "بیشتر پر" کہے ہے۔

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

فطرتِ ہستی شہیدِ آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو

آخری شعر جس کی ترتیب میں نے مندرجہ بالا قائم کی ہے، خاص اعتناء کا مستحق ہے۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک یہ انقلاب، یہ موت، یہ تغیرات، صرف اس لیے ہیں کہ فطرت کو ایک بہترین "پیکر" کی ضرورت ہے۔ اور یہی وہ آخری اور مکمل ہیولیٰ ہوگا جو مقصودِ تخلیقِ عالم ہے۔

اب اس کے بعد وہ دَور شروع ہوگا جسے دوزخ اور جنت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جہنم کی بابت تو قرآن کریم نے صاف بتا دیا ہے کہ "وہاں نہ مرنا ہوگا اور نہ جینا" (۲۰/۷۴) وہاں کشمکش حیات کے بدترین مناظر ہوں گے اور بس۔ لیکن جنت میں بھی سکون جو میسّر ہوگا وہ جمود کے مانند نہ ہوگا بلکہ وہاں بھی ایک ترقی کی خواہشیں ہوں گی، خواہ وہ حریفانہ نہ سہی۔

لیکن وہ جو حقوق اللہ کی ادائیگی میں غافل نہیں، انھیں بلند مقامات میسّر ہوں گے۔ اور پھر ان سے بھی بلند جو ان کے لیے تیار ہیں (۲۰/۳۹)

اقبالؒ اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات
جلوہ گاہیں اُس کی ہیں لاکھوں جہانِ بے ثبات
مختلف ہر منزلِ ہستی کی رسم و راہ ہے
آخرت بھی زندگی کی ایک جولانگاہ ہے

ہے وہاں بے حاصلی کشتِ اجل کے واسطے
سازگار آب و ہوا تخمِ عمل کے واسطے
نورِ فطرت ظلمتِ پیکر کا زندانی نہیں
تنگ ایسا حلقۂ افکارِ انسانی نہیں

باب چہارم

مذہبِ اسلام

پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

اس مقالہ میں اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی اُن پیش گوئیوں سے بحث کی گئی ہے جو آپ نے مذہبِ اسلام کے احیاء کی بابت فرمائی ہیں۔ فی الوقت جب دُنیا اور بالخصوص مسلمان فرائض اسلامیہ کو ایک دُور از کار نظامِ حیات کی بوسیدہ یادگار سمجھے ہوئے ہیں۔ علامہ کی پیش گوئی امید افزا ہے اور رفتارِ واقعات بتا رہی ہے کہ علامہ کا یہ دعویٰ صحیح ہے۔

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

تحلیلِ مضامین

۱ - اِسلام کیا ہے ؟ : قرآن مجید میں جنّتِ ارضی و سماوی کا ذکر - جنّت آدم کی حقیقت - ارتقائی عالم - آدم کے اخراجِ جنّت کا صحیح واقعہ - اسلام (جو مبنی بر اصولِ فطرت ہے) لافانی ہے - اقبالؒ کی بہترین دلیل -

۲ - اِسلام کا مستقبل : مستقبل اسلام کو سمجھنے کے لیے چار طریقۂ ہائے امتحان ،
(۱) بانی مذہب کی جانچ (۲) فلسفۂ اسلام کی تحقیق
(۳) عملیات مذہبی کا امتحان (۴) معتقدین مذہب پر اثرات
علامہ اقبالؒ کی ایمان پرور قنوطیت - واقعۂ نبوی صلعم

۳ - تخیلاتِ اسلامیہ کی تشکیلِ نو : اسلام کی مثال - مجتہدین میں اقبالؒ کا شمار - علامہ غزالی سے مماثلت - صلوٰۃ کی بابت اقبالؒ کے خیالات -
اسلام کے روشن مستقبل کی توجیہہ -

۴ - قرآنی پیشگوئیاں : خصوصیاتِ قرآنی - حامل قرآنی و روح قرآنی -
اِسلام کے غیر فانی ہونے کے قرآنی دلائل -

باب چہارم

مذہبِ اسلام

تری فطرت نہیں ہے ممکناتِ زندگانی کی — جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہانِ آب و گِل سے عالمِ جاوید کی خاطر — نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا (اقبالؒ)

۱۔ اسلام کیا ہے؟

اب تم خود کو اُس سچے قانون کا مطیع بناؤ، یعنی خدا کی اُس پیدا کردہ فطرت کا جس پر اُس نے تمہیں خلق کیا ہے۔ (قرآن مجید ۳۰/۳۰)

کسی شئے کے مستقبل کا صحیح علم اُسی وقت ہو سکتا ہے جب آپ اس چیز کی اصلیت سے واقف ہو جائیں۔ اس لیے اسلام کے مستقبل کا صحیح اندازہ اسلام کی حقیقت کے علم کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید صاف اور صریح الفاظ میں دو مختلف المکان جنتوں کا ذکر فرماتا ہے (۱) اول وہ جو آسمانی ہے (قرآن ۳۰/۱۹) اور دوم دنیاوی۔

جو متقین کو اس دنیا میں دی جائے گی وہ کسی قدر مشابہ ہے اس جنت سے جن کا اُن سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ (۳۰/۱۳)

آدم علیہ السلام کو جو جنت عطا کی گئی تھی وہ دنیاوی جنت تھی۔ جو دراصل بہترین و منظم حکومت تھی۔ اس عجیب و غریب انکشاف کو سن کر آپ ضرور متحیر ہوئے ہوں گے۔ اس لیے کہ شاید آپ کے کانوں میں یہ پہلی آواز ہے۔

واقعہ ہے کہ یہودیّت کے جتنے بھی مسموم اثرات اسلام پر ہیں۔ اس میں بدترین اثر اس جنّت کی تاویل کی صورت میں پیدا ہوا۔ اس خوش آیند مستقبل لعید جنت نے بہت جلد اپنی کشش کھو دی۔ لیکن اگر ملّاؤں نے جنّت و دوزخ کا صحیح تخیل پیش کیا ہوتا تو ہمارے اعمال ایسے بد نہ ہوتے۔ مثال کے طور پر اپنے سامنے محمد شاہ (۱۷۱۹ء۔ ۱۷۴۸ء) "رنگیلے" کا دورِ حکومت رکھیے۔ مرحوم کی بے فکرانہ زندگی کا صحیح نقشہ اس شعر سے معلوم ہوتا ہے جو اُن سے منسوب کیا جاتا ہے۔

اب تو آرام سے گزرتی ہے — عاقبت کی خبر خدا جانے

کاش اس بیچارے کو معلوم ہوتا کہ اس "عاقبت" کے علاوہ جب بداعمالوں کو دائمی دوزخ کے مزے چکھنے ہوں گے۔ ایک مستقبل قریب میں بھی عاقبت ہوگی جب اس کی اولاد دلّی اور بنارس کی گلیوں میں کُتوں کی موت ماری جائے گی۔ میں کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ آپ ضرور اُن نصوص صریحہ کے منتظر ہوں گے جن کی بنا پر میں نے ایسا انقلابی خیال پیش کیا ہے کہ آدم کی جنّت دراصل بہترین منظم حکومت تھی۔ آئیے میں قرآن مجید سے اس کا ثبوت دوں۔

جنّتِ آدم کی حقیقت

ارتقائی حیات کی سب سے پہلی مادّی کڑی جس کی ہمیں خبر دی گئی ہے وہ "پانی" تھی (قرآن ۳۰/۲۱)اُس کے بعد آگ کا وجود ہوا، پھر فضا بخار آلود ہوئی (قرآن ۴۱/۱۱) جس میں ایک ذی عقل مخلوق نے جنم لیا جسے قرآن (۵۰/۱۸) "جن" (پوشیدہ) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جن کی آتش مزاجی کا ثبوت بھی موجود ہے۔ (قرآن ۷/۱۲) اُنھوں نے آپس میں خوب قتل و خونریزی کی جس کا ثبوت فرشتوں کی اس پیش گوئی سے ہوتا ہے جو اُنھوں نے انسان کے خلیفہ بنائے جانے کی بابت کی (۲/۳۰)

حیات کی دوسری شاخ "طبقًا عن طبقٍ" (قرآن ۸۴/۱۹) جب ترقی کرتی ہوئی انسان کی صورت میں رونما ہوئی اور یہ جب سن شعور کو پہنچا تو اسے جنّوں کی پیش روی (خلافت) عطا ہوئی۔ یہ دراصل بنائے مخاصمت تھی جو شیطان کو (جو جنوں میں سے تھا ۱۸/۵۰) حضرت انسان سے پیدا ہوئی۔ ان واقعات

کو نظر انداز کرتے ہوئے جو نفسِ مطلب سے غیر متعلق ہیں ہم اس جگہ پہنچتے ہیں جب فرشتے یہ پیش گوئی کرتے ہیں کہ یہ تو دنیا میں رہ کر (جنوں کی طرح) خون بہائے گا۔ لیکن مرضی مولا۔ خدا کا حکم ہوتا ہے۔

اے آدم! تم اور تمھاری زوجہ اس باغ میں قیام کرو اور اس میں جہاں چاہو
کھاؤ پیو! مگر اس "درخت" کے قریب نہ جانا کیونکہ اگر تم نے ایسا کیا تو
ظالموں میں شمار ہوگے (قرآن ۲/۳۵)

"اس درخت" سے "سیب کا درخت" یا "گیہوں کا پودا" مراد لینی کتنی بڑی "نادانی ہے اور سیاق و سباق کے خلاف ہے۔ اوّل تو "اِس" کا اشارہ اس کا مقتضی ہے کہ مشارٌ الیہ کہیں قریب ہے۔ پھر "شجر" سے عام درخت مراد نہیں۔ اس کی تشریح آیۂ کریمہ (۱۴/۲۶) سے ہوتی ہے جس میں "بدی" کو اُس درخت سے مشابہ بتایا گیا ہے جس میں کوئی پائداری نہیں اور جس کی جڑیں دُور تک زمین کے اندر پھیلی ہوتی ہیں۔ دراصل اس "شجر" سے فرشتوں کی اُس "برائی" "قتل و خونریزی" کی طرف اشارہ ہے جس کے ہولناک نتائج انسانی سوسائٹی کو اس طرح تباہ کر دیتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو حکم تھا کہ ایک بے گناہ کا قتل ایسا ہے جیسا کہ تمام انسانوں کا (قرآن ۵/۳۲) اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو نسائی نے اپنی مسند میں روایت کی ہے۔

اگر سارے زمین و آسمان مل کر ایک بے گناہ مسلمان کو قتل کر دیں تب خدا
سب کو جہنم میں بھیج دے گا۔

حضرت آدمؑ کے بقیہ قصہ میں بہت تھوڑا خلا ہے جو بآسانی پُر ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ہابیل کی ملکوتی صفات (قرآن ۵/۲۸) نے قابیل کو جب اس کے قتل پر آمادہ کیا اور قتل واقع ہوا۔ تب آدم اور اس کی قوم نے لیپ پوت (قرآن ۷/۲۲) شروع کی۔ جس کی پاداش میں ساری قوم حکومت سے محروم کر دی گئی۔[1]

[1] میں نے اس واقعہ کو بطور اکمل قرآن مجید کی صریح آیات سے اپنی زیر طبع تصنیف "تخیل محمدی کا ارتقا" میں ثابت کیا ہے۔ ملاحظہ ہو آیات قرآنی ۷/۲۶ جہاں لباس تقویٰ کا ذکر ہے۔ ۷/۲۲ جہاں "اخراج آدم" کا ذکر ہے بسزا جرم کے مناسب ہوتی ہے۔ اس لیے تقرب شجر پر اخراج بے معنی ہے بلکہ وہ "قتل" تھا جس کی سزا "آپس کی عداوت" ہی ہو سکتی تھی (۷/۲۴) وغیرہ وغیرہ

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

تم دونوں نکل جاؤ (بلکہ) سب کے سب نکل جاؤ (جمیعا) (۲۰/۱۲۴)

ع اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

نکالے جاتے وقت آدم اور اُن کی قوم کو یہ تسکین بھی دی جاتی ہے:

یقیناً تمھارے پاس میری جانب سے ایک ہدایت آئے گی تب جو اُس کا اتباع کرے گا اُس پر نہ تو کوئی خوف طاری ہوگا اور نہ حزن (۲/۳۸)

نوحؑ سے لے کر عیسیٰؑ تک اُس ہادیٔ برحق کی آمد کی خوش خبریاں دیتے رہے جو دنیا میں آکر ایک جنت بنائے گا۔ بالآخر وہ ہستی رونما ہوئی اور اس نے وہ کر دکھایا جو کسی سے نہ ہو سکا۔

بلیشک محمدؐ اور اُن کے خلفا نے وہ مکمل حکومت قائم کی جس کی مثال دُنیا میں معدوم ہے۔ (ڈاکٹر برول جلد ۱)

اور اُس ذات بابرکات نے مکمل قانون چھوڑا جس کا اتباع اگر کیا جاتا یا اب بھی اگر کیا جائے تو دُنیا میں دوبارہ جنّت قائم ہو سکتی ہے۔

میں نے اس تمہید میں قدرے طوالت سے کام لیا لیکن یہ ناگزیر تھا۔ مقصود یہ ہے کہ وہ قانونِ حیات جس پر فطرت نے ہزارہا سال تجربات کے صرف کیے اور پھر انسانی زندگی کے لیے اسے ایسا مفید و مکمل بنایا جس سے دوزخ جنت میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ وہ کیوں کر فنا ہو سکتا ہے۔ اسلام کے قوانین فطرت پر مبنی ہیں اور فطرت ارض و سما کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس لیے اسلام کی حقیقت ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی۔

خدا مسٹر "شاملو" کو اجر دے جنھوں نے علامہ اقبالؒ کی تحریرات و تقاریر کو مجموعی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ اس میں ایک جگہ علامہ نے ایک شعر بھی نہ کہا ہوتا اور کوئی بھی تصنیف نہ چھوڑی ہوتی تو صرف یہ ایک انکشافِ حقیقت اُن کی علوی مرتبت کے ثبوت کے لیے کافی تھا۔

اس "عقل و دل" نکتہ کا لفظی ترجمہ میرے بس سے باہر ہے۔ اس لیے اس کی تشریح یوں ہوگی:

اسلام فی نفسہٖ حیاتِ عالم کا منتہائے مقصود ہے۔ اس لیے گو انقلاباتِ

روزگار اس کی عارضی صورتیں بدلتے رہیں لیکن اس کا جوہر اصلی کبھی بھی فنا نہیں ہو سکتا۔ چونکہ فطرت کی غرض یہ ہے کہ "حیات" اسی قانون کے مطابق جاری رہے اور ختم بھی ہو۔ اس لیے درمیانی انقلابی تغیرات اس کی ہیئت اصلی میں کوئی فرق نہیں لا سکتے۔

اب اس نکتہ کو سرنامہ پہ لکھے ہوئے اشعار کے ساتھ پڑھیئے تو لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

۲۔ اسلام کا مستقبل :۔

بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایّام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

کسی مذہب کے ماضی۔ حال و استقبال کا صحیح اندازہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ اس کا چار نوعیتوں سے مطالعہ کریں۔

(۱) بانی مذہب کا دنیا نے ماضی میں کیوں کر استقبال کیا۔ زمانہ حال میں اس کی بابت کیا خیالات ہیں، اور رفتار زمانہ اس کو مستقبل میں کیا سمجھنے والی ہے۔

(۲) فلسفۂ مذہب کو دنیا نے کیا سمجھا، فی زمانہ مفکرین کی اس کی بابت کیا رائے ہے اور امتداد زمانہ اس کے مستقبل کی بابت کیا پتہ دیتا ہے۔

(۳) عملیاتِ مذہب کہاں تک مفید ثابت ہوئے۔ فی الوقت اس کے معتقدین اس پہ کس حد تک کاربند ہیں اور آئندہ زمانہ میں وہ کہاں تک قابلِ عمل سمجھے جائیں گے۔

(۴) معتقدینِ مذہب پہ اس مذہب نے کیا اثرات پیدا کیے، اس وقت اس کے ماننے والے

کس حال میں ہیں اور آیندہ ان کا کیا حشر ہونے والا ہے۔
اب ان ہر چہار نوعیتوں سے اسلام کو جانچیئے۔ اُس وقت اور اُسی وقت آپ اُس کے مستقبل کی بابت صحیح پیش گوئی فرما سکتے ہیں۔

(۱) بانی مذہب صلعم

مَیں اس دُنیا کی بزرگ ترین ہستی کی بابت دقیق نکات بیان کر کے خواہ مخواہ مبحث کو مطلول نہیں کرنا چاہتا، لیکن ایک مشہور عیسائی مستشرق کا خیال ہے جو نقل کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

ظہور اسلام کے بعد چند دنوں تک تو مفتوحین کا بغض و حسد انھیں اسلام کو مطعون کرنے پر مجبور کرتا رہا۔ لیکن جب اتنے فرسودہ مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کے فوائد کا احساس ہُوا تو ان کی نفرت بہت جلد تحسین میں بدل گئی۔ اس پر بھی جو ضدی طبیعتیں باقی رہ گئی تھیں وہ نظام حکومت سے کچھ اس درجہ مرعوب رہیں کہ کسی کو سب و شتم کی جرأت نہ تھی۔ (فارسٹر آن محمدؐ)

لیکن جب مسلمان رو بہ زوال ہوئے تو وہ ساری پُرانی دبی ہوئی عداوتیں اُبھر آئیں اور عیسائی دُنیا نے خوب دل کھول کر رسول عربیؐ کی شان میں گستاخیاں کرنی شروع کیں۔ مگر پھر زمانے نے کروٹ لی اور بحمدہ بجز مسئلہ ختم نبوت کے اور تمامی حیثیت سے آج یورپ رسول اللہ صلعم کی تعریف میں مسلمانوں کا ہم آہنگ ہے۔

"محمد رسول اللہؐ واقعتاً انبیاء میں سے تھے اور حامل وحی تھے" (نکلسن)

"آج دُنیا کی تمامی سیاسی و اخلاقی بے چینیوں کا واحد علاج اسلام ہے۔" (برنارڈ شا)

مبصرین کا خیال ہے کہ بحوائے پیش گوئی صدر آیۂ کریمہ ربک ان یبعثک ربک مقاماً محموداً۔ وہ زمانہ جلد آنے والا ہے جب دُنیا موجودہ مسلمانوں سے زیادہ محمد الرسول اللہ کی صداقت کی معترف ہوگی۔

(۲) فلسفۂ مذہب اسلام

بالکل یہی حالت اسلام کی ہے۔ زمانۂ وسطیٰ میں مغربی اقوام کے نزدیک اسلام و درندگی مرادف تھیں لیکن جوں جوں حقیقت کے چہرہ سے پردہ ہٹتا جارہا ہے دنیا فلسفہ و نظریاتِ اسلام کی قائل ہوتی جارہی ہے۔ برنارڈ شا کا مندرجہ بالا مقولہ اس کی تائید کے لیے کافی ہے۔ اصلیت تو یہ ہے کہ خود مسلمانوں نے اسلام کی ہیئت بدل ڈالی۔ ورنہ آج دُنیا میں بجز اسلام اور کوئی مذہب جاری وساری نہ ہوتا۔

(۳) عملیاتِ مذہب

یہ شق مسئلہ قابلِ غور ہے اس لیے کہ یہاں پہنچ کر ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جن عملی فرائض نے متقدمین کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔ وہی فرائض یا تو بعض کے نزدیک بے کار ہیں یا پھر ناقابلِ عمل یا بے سود۔ اس کے اسباب کا سمجھنا تو مشکل نہیں لیکن افسوس اس کا کہ

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی (غالبؔ)

اقبالؒ نے اس کی توجیہہ صحیح فرمائی ہے:

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اس بے حسی کے اسباب اتنے پیچیدہ اور متعدد ہیں کہ اُنھیں رفع کرنا اگر ناممکن نہیں تو نہایت مشکل ضرور ہے۔ ہندوستانی مسلمان ہی کو لیجیے۔ غدر سے آج تک صدہا تحریکیں تبلیغ اسلام کی

قسمتِ عالم کا مسلم کوکب تابندہ ہے

شروع ہوئیں۔ لیکن ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

ایسی حالت میں یہ تلخ حقیقت ماننی پڑے گی کہ اسلام کا عملی پہلو بہت مشتبہ روشن مستقبل رکھتا ہے۔ خود احادیث اس کی موید ہیں ؎

شوق بے پروا گیا فکرِ فلک پیما گیا
تیری محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے

چونکہ ایک محقق کا فرض ہے کہ وہ اپنے اعتقادات کا اظہار بے کم و کاست کر دے۔ اس لیے میں علامہ کی قنوطیت کا شریک نہیں لیکن یہ اختلاف صرف فرقِ ایمانی کے باعث ہے۔ علامہ بامِ ایمان کی اُس اعلیٰ منزل پر پہنچے ہوئے ہیں جہاں تشادم کفر ہے۔ وہ اُس صاحبِ ایمان کی روح الیقین سے سرشار ہیں جس نے باوجود حکم صریح:

خواہ تم ستّر بار بھی منافقوں کی شفاعت کرو لیکن اللہ انھیں معاف نہیں فرمائے گا۔ (قرآن ۹/۸۰)

امیر المنافقین (عبداللہ بن ابیّ) کے لیے یہ کہہ کر دعائے مغفرت فرمائی کہ خدا نے "ستّر بار" فرمایا ہے۔ مَیں اس سے بھی زیادہ ان کے لیے دعائے مغفرت کروں گا۔ یہی سبب ہے کہ علّامہ اس سے ناامید نہیں کہ ملّتِ اسلامیہ دوبارہ اعمال و فرائض اسلامیہ کی طرف ایک نہ ایک دن رجوع ہو کر رہے گی۔ ؎

ہے بھروسا اپنی ملّت کے مقدّر پر مجھے

علّامہ اقبالؒ کی چشمِ بصیرت احیائے ملّت میں بانیٔ اسلام صلعم کا تصرّفِ پنہاں دیکھ رہی ہے۔

بہ مشتاقاں حدیثِ خواجۂ بدر و حنین آمد
تصرف ہائے پنہانش بہ چشم آشکار آمد

دگر خاکِ خلیل از خونِ ما نمناک می گردد
ببازارِ محبت نقدِ ما کامل عیار آمد

علّامہ نے محض مستقبلِ اسلام کے لیے پیش گوئی ہی نہیں فرمائی بلکہ اس کے لیے مجتہدانہ سعی بھی فرمائی

جس پر ایک مختصر تبصرہ ضروری ہے۔

(۴) معتقدینِ مذہب پر اثرات

کسی مذہب اور عقیدہ مستقبل کی بابت جو پیشگوئی ہوگی اس میں یہ جاننا بھی ضروری ہوگا کہ ابتداءً اس مذہب کے عقائد نے عوام میں کیا انقلابات پیدا کیے۔ پھر اگر معتقدین میں ضعف آیا تو اُن عقائد کے ترک کرنے سے آیا یا اور کوئی سبب تھا۔

غالباً اسلام کی بابت یہ بتانا ضروری نہیں کہ دُنیا میں جتنے مذاہب گزرے ہیں ان مذاہب میں کسی نے اپنے معتقدین میں وہ انقلابی تغیر و تبدل نہیں پیدا کیا جو اسلام نے کیا۔ دشمنوں سے اس کا اعتراف سنیئے:

"محمدؐ نے اپنی مختصر فانی زندگی میں غیر امید افزا مواد سے ایک ایسی قوم کو پیدا کیا جو کبھی متحد نہ تھی اور وہ بھی ایسے ملک میں جو اس وقت تک محض ایک جغرافیائی مفہوم رکھتا تھا۔"[1] اسلام گو ابتدا میں آہستہ آہستہ بڑھا، لیکن اس کی ترقی بعد میں بجلی کی سرعت کی طرح واقع ہوئی ہے۔[2] "اسلام کی ترقی اور وہ حیرت انگیز انقلاب جو اس نے اپنے معتقدین میں پیدا کیا وہ دنیا میں اپنی قسم کا نادر الوجود معجزہ ہے۔"[3]

آج ہر مورّخ اس کو تسلیم کرتا ہے کہ "سرچشمۂ اسلام جتنا آگے بڑھتا گیا اسی قدر اُس کا پانی گندہ ہوتا گیا"[4] مسلمانوں کے زوال و انحطاط کا واحد سبب ان کی غیر اسلامی و غیر قرآنی زندگی ہے۔ خدا کی طرف سے اقبالؒ "جواب شکوہ" میں کہتے ہیں:

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہوکر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

---

[1] ہٹی "تاریخ عرب" صفحہ ۱۲۱ [2] براؤن جلد ا صفحہ ۱۸۰ [3] ڈی گوئجے [4] نکلسن۔

۳۔ تخیلات اسلامیہ کی تشکیلِ نو:

بہ ہر زمانہ بہ اسلوب تازہ می گویند
حکایتِ غم فرہاد و عشرتِ پرویز (اقبالؒ)

اسلام کی مثال بالکل ایک عمارت کی سی ہے، جس کی ہر ایک اینٹ دوسرے سے وابستہ ہے۔ نماز تہجد سے لے کر ٹخنوں سے اوپر شلوار پہننے تک سب ایک خاص نظام حیات کی تکمیل کے لیے تجویز کیے گئے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جب آپ فرائض تو کجا معمولی سُنّن بھی ترک کر دیتے ہیں تو شیرازۂ اسلام بکھر جاتا ہے۔ قرآن نے اسی لیے "ادخلوا فی السلم کافّہ" (پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ) کی تاکید فرمائی۔ رسول اللہ صلعم اور اُن کے خلفائے راشدین تک تو اس کا لحاظ رہا۔ لیکن بنو امیہ اور اس کے بعد بنو عباس کے زمانہ میں ذہن اسلامی میں تغیرات پیدا ہوئے اور ایسے ہوئے کہ وہ نماز تو کجا، الحاد و کفر فیشن میں داخل تھا۔ یہ دیکھ کر علماء کے کان کھڑے ہوئے اور انھوں نے مجتہدانہ جوش میں اسلام کی تشکیلِ نو کی کوششیں کیں تاکہ ملّت کے اعمال غیر اسلامی نہ ہونے پائیں۔ ان مجتہدین میں سب سے پہلا نام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ جنھوں نے اسلام کو زمانہ کے رجحانات کے لحاظ سے پیش کرنے کی سب سے پہلی کامیاب کوشش فرمائی۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے بعد یوں تو متعدد مخلص ہستیاں انھیں اغراض کو پیش نظر رکھ کر سامنے آئیں۔ لیکن ہمارے اغراض کے لیے علامہ غزالیؒ (۱۱۱۱ء) کا نام سب سے زیادہ روشن ہے۔ شاعرانہ تخیلات میں تو ضرور اقبال رحمۃ اللہ علیہ رومیؒ کے شاگرد معنوی ہیں۔ لیکن اوّل تو رومیؒ خود غزالیؒ کے خوشہ چیں ہیں۔ علاوہ بریں غزالیؒ اور اقبالؒ کے خیالات کا موازنہ فرمائیے تو ان دونوں میں بے حد مماثلت معلوم ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ جس طرح آپ اقبالؒ کو پاکستان کا اصلی بانی سمجھتے ہیں۔ اسی طرح مورخین نے سلطنت موحدین (۱۱۳۰ء–۱۲۱۴ء) کا اصل موسس غزالی کو قرار دیا ہے [۱]۔ غزالیؒ اور اقبالؒ کے اصول تشکیل میں بھی لائحہ عمل کی مماثلت ہے۔ گو غزالیؒ بام حقیقت کے ان مدارج پر پہنچے ہوئے ہیں۔ جہاں سے ان کی بصارت سطح زمین تک پہنچتی ہی

---

[۱] ملاحظہ ہو صفحہ ۳۰۷ تاریخ ادبیات ایران از براؤن جلد ا

نہیں۔ بخلاف اس کے اقبالؒ (بقول رومیؒ)، وہ بانسری ہاتھوں میں رکھتے ہیں جس کا ایک سرا آسمان اور دوسرا زمین پر ہے۔ غزالیؒ کے بعد بھی متعدد مجتہدین رونما ہوئے۔ شاہ ولی اللہ اور مولانا عبدہ مصری انھیں زعماء میں ہیں۔

یہ موقع توازن و تقابل کا نہیں، لیکن اس قدر ماننا پڑے گا کہ جہاں بیشتر مجتہدین نے مراسم کو برقرار رکھتے ہوئے ان کی تسہیل و توجیہہ کی ہے۔ اقبالؒ نے رجحانِ زمانہ کو دیکھتے ہوئے اور "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات" کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے صرف حکیمانہ پہلو پر نظر رکھی ہے تاکہ وہ موجودہ مغرب زدہ طبقہ کم سے کم اسی طرح فرائض اسلامیہ کی طرف رجوع تو ہو جائے۔ آپ کی مشہور تصنیف RECONMPUCTION OF RELIGOUS FLIGHT IN ISLAM ساری کی ساری ان نکات سے مالامال ہے۔ میں صرف "صلوٰۃ" کی بابت ایک مختصر اقتباس نقل کروں گا:

"صلوٰۃ شخصی ہو یا بالجماعت، انسان کی اس اندرونی خواہش کا اظہار ہے جو عالم کائنات کی پُراسرار پُرہیبت خاموش فضا میں جواب کی طالب ہوتی ہے۔ یہ تفحص کا عجیب و غریب طریقہ ہے جس سے متلاشی "انا" اپنی نفی کے ساتھ ساتھ اپنا ثبوت بھی پیش کرتا ہے۔" (صفحہ ۹۳)

آگے چل کر صلوٰۃ کے سیاسی فوائد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

مزید براں یہ (یعنی صلوٰۃ) اس حوصلہ کی مظہر ہے جو تمامی تفریقات و امتیازات باہمی کو میٹ کر ساری بنی نوع انسان کو متحد کرنا چاہتی ہے (صفحہ ۹۴)

دنیا کا تاریخی رجحان صاف بتا رہا ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ حقیقت روشن ہو کر رہے گی کہ

جو کرے گا امتیازِ رنگ و بو مٹ جائے گا

چونکہ بجز اسلام دنیا کا کوئی مذہب اس کا مؤید نہیں اور یہ مسئلہ لاینحل صرف اسلام ہی کے ہاتھوں طے پاسکتا ہے۔ اور خود مسلمان جب تک فرائض اسلامیہ کی طرف رجوع نہ ہوگا۔ اس وقت تک وہ کبھی اس

روشن اصول کی طرف دُنیا کو بلا نہیں سکتا۔ اس لیے مستقبل میں مسلمانوں کا فرائض اسلامیہ کی طرف رجحان ضروری اور لابدی ہے۔

زمانہ کا انقلاب بھی علامہ کا مویّد ہے۔ غدر ۱۸۵۷ء اور اس کے چند سال بعد تک فرائض اسلامیہ کی جانب جو مسلمانوں کی بے حسّی تھی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن زمانہ نے کروٹ بدلی۔ ایک وہ زمانہ تھا جب مغرب زدہ نوجوانوں کی نظروں میں اسلام اور اسلامی تاریخ مزخرفات زیادہ قبیح نہ تھے لیکن بحمدہ کم سے کم ملّتِ اسلامیہ اور اس کے شعائرِ مذہبی کی طرف یہ بے اعتنائی نہیں۔ پہلے تو خلوت میں شعار اسلامیہ کا استہزا ہوتا تھا، لیکن آج اُس کے اصول کی صداقت کا دل سے اعتراف ہے۔ باقی رہے عملیات اُن کی بابت ان کا روّیہ صرف ایک معمولی تبدیلی کا محتاج ہے جو صرف ہدایت ہی سے میسّر ہو سکتی ہے، ورنہ آج نوجوان طبقہ تو غالب کے ساتھ یہاں تک پہنچ چکا ہے۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد ۔۔۔ پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

۴۔ قرآنی پیشگوئیاں:

تڑپ صحنِ چمن میں، آشیاں میں، شاخساروں میں
جُدا پارے سے ہو سکتی نہیں ہے تقدیرِ سیمابی

عقلی و تاریخی دلائل کے بعد بھی اس کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ ہم قرآن مجید کے اوراق اُلٹ کر دیکھیں کہ آخر خدا نے اس مذہب کی میعادِ حیات کیا قرار دے دی ہے۔ مگر جا بجا قرآنی آیتیں دلائل میں پیش کی جا چکی ہیں با اینہمہ اُن کا اجتماع مخصوص عنوان کے تحت اور ان پر بحث لطف سے خالی نہ ہوگی۔

اسلام دراصل پیامِ قرآنی کا دوسرا نام ہے۔ اس لیے اس مخصوص مبحث کے لیے ہم اس پیامِ قرآنی کے مستقبل کو تین حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں (۱) خصوصیات قرآنی (۲) حامل قرآنی اور (۳) روح قرآنی اور یہ جانچیں کہ آیا ان میں کون فانی ہے اور کون باقی۔ اگر قرآنی اسناد ہر سہ کو لافانی قرار دے دیں تب تو ناظرین کو اسلام کے روشن مستقبل میں کوئی شک رہنا نہیں چاہیئے۔

جلوۂ طور تو موجود ہے موسےٰ ہی نہیں

(۱) حاملِ قرآنی (صلی اللہ علیہ وسلم)

ابن عبداللہ ضرور انسان تھے اس لیے دُنیا سے پردہ فرما گئے، لیکن محمد الرسول اللہ فانی نہیں۔ وہ بفضلہ صاحبِ حیات ہیں اور اپنی امت کے لیے دست بہ دُعا ہیں۔ اقبالؒ کا بھی یہی عقیدہ ہے۔

بہ مشتاقاں حدیث خواجہ بدر و حنین آمد
تصرف ہائے پنہانش بہ چشمم آشکار آمد

اب آپ اس کے قرآنی دلائل سنئیے:۔

قرآن مجید اپنے خاص بندوں کی فہرست اس ترتیب سے دیتا ہے:۔

النّبیین (۱) والصّدّیقین (۲) والشّہداء (۳) والصّٰلحین (۴) (۴/۶۹)

اور شہداء کی بابت ارشاد ہوتا ہے کہ شہداء فی سبیل اللہ کو مُردہ نہ سمجھو وہ تو زندہ ہیں۔ تم ان کی زندگی کی حقیقت نہیں سمجھتے (۲/۱۵۴) یہی نہیں بلکہ "اُنھیں خدا کے دربار سے رزق ملتا ہے (۳/۱۶۸) جب تیرے بندوں کو یہ بقاء نصیب ہے تو پھر وہ گروہ جو اوّلین صف میں ہو اور اس گروہ کا سردار اس سے کیوں کر محروم رہ سکتا ہے۔ کیا آپ قعدہ نماز میں "السلام علیک" نہیں فرماتے، یہ واحد حاضر ہے۔ یہ تو شخصیت حامل قرآنی تھی۔ اب اس کے مقاصد کو دیکھیے:۔

(۱) اب آپ ایک برگزیدہ ترین ہستی کا تخیل نظروں کے سامنے رکھیے۔ جس کی آمد آمد کی پیشگوئی ہزارہا سال سے انبیاء کرتے آئے (۳/۸۰) اور جب خاتم سلسلۂ نبوت ہو کر دنیا میں آیا تو وہ کسی ایک قوم و قبیلہ کے لیے نہیں آیا، جیسا کہ اب تک آتے رہے بلکہ ساری دنیا کے لیے (۲۱/۱۰۷) اس لیے اس میں وہ تمام صفات رکھی گئیں جو خیال میں بھی آسکتی ہوں (۴/۶۸) وہ جب قانونِ حیات کی قولی و فعلی تکمیل کر چکا (۵/۳) تب خود اس کی مرضی کے مطابق (حدیث) وہ خوش خوش یہ کہتا ہوا مادی نظروں سے غائب ہو جاتا ہے:۔

خرم آں روز کزیں منزلِ ویراں بروم
راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم

اُس کے کلام کا مقصد ساری دنیا کو متحد کرنا تھا۔ اس لیے اُسے روحانی تصرفات میسر ہوتے ہیں۔ جس سے وہ کام لے کر اس وقت تک رو بہ ترقی رہیگا جب تک کہ یہ "اتمام توحید" مکمل نہ ہو۔ اس روحِ اعظم کی ترقی سریع ہے۔ دَیْدَہٗ اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ

کچھ بھی پیغامِ محمد کا تجھے پاس نہیں

مقاماً محموداً۔ بتارہی ہے کہ جس طرح وہ روز بروز اقوام کی نظروں میں مقبول ہو رہا ہے۔ اُسی طرح وہ اُس کا مقصود بھی قریب الحصول ہے۔ کیا آج دنیا افتراق و اختلاف سے تنگ آکر "جمعیت آدم" کے مقام کی متمنی نہیں؟ یہی روحِ محمدی ہے اور یہی اسلام۔ پھر آپ کیوں اسلام کے روشن مستقبل سے ناامید ہیں؟

(۲) یہ تو حاصل قرآنی کے لافانی ہونے کی دلیل تھی۔ اب خصوصیات قرآنی کے "باقی باللہ" ہونے کی دلیل ملاحظہ ہو۔

(الف) قرآن مجید کے نزول کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ اقوام کے اختلافات کا ایک اصولی تصفیہ کر کے اُنھیں متحد کر دے (۲/۲۱۳ و ۶/۹۱) اس لیے ایسی کتاب محفوظ و مامون بنائی گئی (۹/۱۰) تاکہ جب تک یہ مقصود پورا نہ ہو اس وقت تک تحریف و تلف سے محفوظ رہے اور اسی لیے اُس کو تمامی علوم کا سرچشمہ بنایا تاکہ ہر قوم و ملت ہر زمانہ میں اس سے استفادہ کر سکے (۱۷/۸۹)

ظاہر ہے کہ یہ مقصود قرآنی ابھی تک حاصل نہیں ہوا۔ اس لیے جب تک یہ حاصل نہ ہو جائے اُس وقت تک قرآن کی موجودگی ضروری ہے۔

(۳) اب اس کی تیسری شق روحِ قرآنی ہے جس کی بابت قرآن پیش گوئی فرماتا ہے کہ

یہ تمامی مذاہب پر غالب آئے گا (۴۸/۲۸ و ۹/۳۳) اور اپنے نور سے

تکمیلِ حیات کے مقاصد پورے کرے گا (۸/۶۱ و ۹/۳۲)

ظاہر ہے کہ گو اُس غلبہ کی ابتدا بحمد اللہ ہو چکی ہے لیکن ابھی تک مذاہب عالم اسلام کی حقیقت کے سامنے صرف رو بہ رکوع ہیں۔ اس لیے جب تک وہ گھٹنے ٹیک کر ماتھا نہ ٹیک دیں اس وقت تک تو یہ پیش گوئی مکمل نہیں کہی جا سکے گی۔

مجھے یقین ہے کہ میں نے اس مقالہ میں قارئین کو تشفی بخش دلائل سے بتا دیا کہ اِسلام لافانی مذہب ہے اور وہ رو بہ ترقی ہے۔ اُس کے مسنونات میں انقلابات صرف اس لیے واقع ہوتے رہتے ہیں کہ ع

خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو

باب پنجم

ملّتِ اسلامیہ (۱)

پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

اس مقالہ میں اقبالؒ کی ان پیش گوئیوں سے بحث کی گئی ہے جو آپ نے ملّتِ اسلامیہ کے مستقبل کی بابت فرمائی ہیں۔ پہلے ایک ملّت کی پائندگیٔ حیات کا معیار بتایا گیا ہے اور پھر اس معیار پر بالتفصیل مسلمانوں کے روشن مستقبل کا ثبوت دیا گیا ہے۔

تحلیل مضامین

۱۔ تمہید۔ معیار: (کسی قوم کے استقبال کو جانچنے کے طریقے)

۲۔ قانونِ حیات: اس کی یکساں منفعت۔ اس کا تخیل عروج۔ کیا اُس میں اپنے شیرازہ کو مجتمع کرنے کی اہلیت ہے۔

۳۔ تاریخ قومی: اُس کی بنیادی تحریک تاریخی۔ اُس کی فتوحات و شکستوں کا راز۔ اُس کا نظریۂ وطنیت

مذکورہ بالا محک امتحان پر ملت اسلامیہ پوری ہوتی ہے یا نہیں۔

(الف) (۱) تعزیری قوانین۔ معاشرتی قوانین۔ اسلامی اخلاقیات۔ مذہبی قوانین۔

(ب) اسلام کی کشش۔ دو مختلف دور میں دو مختلف عیسائیوں کے خیالات میں بُعد المشرقین۔

۴۔ مذکورہ بالا امور میں اقبالؒ کے خیالات، مسلمانوں کے روشن مستقبل پہ عاقلانہ و محققانہ دلائل۔ مقصودِ حیات عالم اتمام توحید ہے۔

باب پنجم

مِلّت اسلامیہ

ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

ا۔ تمہید۔ معیار:۔

جو فرق روح اور مادہ میں ہے وہی امتیاز مذہب اور معتقدینِ مذہب میں ہے۔ مگر جس طرح روح کا ظہور بغیر مادہ ممکن نہیں۔ اسی طرح مذہب کا ظہور اس کے معتقدین کی صورت ہی میں ہوتا ہے۔ کسی مذہب کے مستقبل کی بابت پیش گوئی کن کن اسباب کی پیش گوئی کی بنا پر کی جاسکتی ہے یہ تو آپ کی نظروں سے گزر چکی۔ لیکن اس سے کسی قدر مختلف اسباب وہ ہوتے ہیں جن کی بنا پر معتقدین کا مستقبل جانچا جاسکتا ہے۔ اس اختلاف کا اصل سبب یہ ہے کہ آپ جب کسی مذہب کے مستقبل کو دریافت کریں گے اُس وقت اُس کی اصل روح مذہب کو لیں گے۔ امتداد زمانہ نے جو اس میں تبدیلیاں پیدا کر رکھی ہیں۔ انھیں نظر انداز کرنا پڑے گا۔ لیکن اس کے معتقدین ہر زمانے میں بدلتے رہتے ہیں اور اُن کے عمرانی و ذہنی قویٰ میں بھی مدّوجزر ہوتا رہتا ہے۔ ہر نئی قوم اپنی تاریخی روایات لاتی ہے اور اپنا کارنامہ ماضی چھوڑ جاتی ہے۔ اس لیے کہ کسی قوم کا مستقبل دریافت کرتے وقت اُس کے اصلی مذہبی اثرات کو نظر انداز تو نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اُن کی حیثیت اس امتحان میں ثانوی ضرور رہ جاتی ہے۔

اقوام کی زندگی میں ایک ہزار ایک اثرات کارفرما ہوتے ہیں۔ بعض ایسے جن پر عام نظریں پڑ سکتی ہیں اور بعض وہ جنھیں ایک مبصر ہی دیکھ سکتا ہے اور بعض ایسی بھی ہیں جن کے سمجھنے سے ہم آج تک

قاصر ہیں۔ ان حالات میں اُنھیں اثرات کو پیشِ نظر رکھ کر کوئی حکم لگایا جا سکتا ہے جو عام و خاص کی نظروں سے مخفی نہیں ہیں۔ ان اثرات میں مندرجہ قابلِ توجہ ہیں۔

۱۔ قانونِ حیات:۔

(الف) کیا یہ قوم ایسے قانونِ حیات کی حامل ہے جو زمانہ کی ہر تاریخی تحریکی تبدیلی میں یکساں طور پر مفید ہو؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو پھر اُس کے مستقبل کے دریافت کرنے میں جو وقت بھی صرف ہوگا وہ رائگاں جائے گا۔ اس لیے کہ زمانہ اس سرعت سے بدلتا رہا ہے اور بدلتا رہے گا کہ جس قوم میں کوئی ایسا قانون نہیں جو اُسے ہر نئی محفل میں صدر نہ بنا سکے۔ اس کا کوئی مستقبل نہیں۔

(ب) کیا اس قوم کا مشعلِ حیات کوئی ایسا منضبط قاعدہ پیش کرتا ہے جس سے دوسری اقوام کو خود میں مدغم کیا جا سکے یا نہیں؟ اور اگر نہیں تو اس حالت میں اُس قوم کا کوئی روشن مستقبل نہیں۔ اس لیے کہ اس تنازع للبقا میں جو دوسروں کو ہضم نہیں کر سکتا اُسے دوسرے ہضم کر ڈالتے ہیں۔

(ج) کیا اس قوم کا ضابطۂ زندگی عروج کا ایک عامی نقطۂ خیال پیش کرتا ہے یا ایسا ارفع و اعلیٰ معیار پیش کرتا ہے جو نہ صرف عقلِ انسانی کی منتہیٰ ہو بلکہ جسے دیکھ کر پروازِ تخیّل کو بھی مجبوراً یہ کہنا پڑے:

اگر یک سر موئے برتر پرم — فروغِ تجلّی بسوزد پرم

(د) کیا اُس قوم کے قاعدۂ زیست میں اپنے معتقدین کے بکھرے ہوئے شیرازوں کو ایک مرکز پر مجتمع کرنے کی صلاحیت ہے؟ اگر نہیں تو اس کشمکشِ حیات میں آپ کا انتشار دوسروں کے اجتماع کا کبھی حریف نہیں بن سکتا۔

۲۔ تاریخ قومی:۔

(الف) کیا قدرت نے اُس میں کوئی ایسی تحریکی قوت ودیعت کی ہے جس کے باعث اس میں مدوجزر کی تاریخی تکرار آئے دن ہوتی رہتی ہے اور کیا یہ تحریک تکرار انجام کار ایک مستقل ترقی کی صورت میں نمودار ہوگی۔

یہ نہایت باریک نکتہ ہے اور چونکہ دنیا کے سامنے یہ پہلی بار پیش کیا جا رہا ہے۔ اس لیے اسلام کے مستقبل میں دلچسپی لینے والوں کو اس کی توضیح کا بغور مطالعہ کرنا چاہیئے۔

(ب) کیا اُس قوم کی تاریخ میں فتوحات و شکستیں بھی رونما ہوئیں ؟

فتوحات :- (۱) فتوحات میں مادی اثرات غالب تھے یا روحانی ؟

(۲) کیا فاتحین نے مفتوحہ ممالک میں کوئی متمدن سلطنت قائم کی ؟

شکستیں : (۱) کیا اُس کی شکستیں منافقین کے قرب سے واقع ہوئیں یا دشمن کی چیرہ دستی سے ؟

(۲) کیا شکستوں نے اُسے مشاومت و اضمحلال کا دائمی شکار بنا دیا یا پھر اُبھنے کی راہیں لیں ؟

(ج) کیا یہ قوم "وطنیت" کی معتقد ہے ؟ کیا اُس کے زریں کارنامے امتیازِ رنگ و بو کے موئید ہیں ؟ یوں تو اس قسم کے متعدد محک امتحان بتائے جا سکتے ہیں لیکن مذکورہ بالا وہ خاص ہیں جن کو پیشِ نظر رکھ کر اب کسی ملّت یا قوم کے مستقبل کی بابت صحیح رائے قائم کر سکتے ہیں کہ آیا وہ کم سے کم دیگر اقوام کے دوش بدوش ایک ذی عزت زندگی بسر کر سکے گی یا دنیا میں اس کی زندگی و موت برابر ہیں ۔

مذکورہ بالا معیار کی مطابقت

(الف) کیا یہ قوم ایسے قانونِ حیات کی حامل ہے جو زمانہ کی ہر تاریخی تحریکی تبدیلی میں یکساں طور پر مفید ہو ؟

جمعیت اسلامیہ کے لیے "قوم" سے زیادہ "ملّت" کا لفظ موزون ہے - اس لیے کہ قوم میں "وطنیت" کا اثر غالب ہے، لیکن اسلام عالمگیر مذہب ہے اور ہر مسلمان خواہ وہ کسی حصّہ ارض کا ہو وہ دوسرے مسلمان کا بھائی ہے (۱۰/۴۹) اور اس سے زیادہ قریب ہے جو ایک فردِ قوم دوسرے فردِ قوم سے ہوتا ہے ۔ یہ تو مسلّم ہے کہ ایک مسلمان کا قانونِ حیات قرآن مجید ہے، لیکن یہ ضرور محتاجِ ثبوت ہے کہ آیا یہ ہمیشہ ہی رہے گا یا نہیں - اس لیے کہ جو قانون [illegible] لفظی و معنوی صورتوں میں قدیم نہ ہو وہ ازل تک کی تمامی تبدیلیوں پر حاوی نہیں ہو سکتا ۔

پہلے تو قرآن مجید کی ظاہری صورت کو لیجیے ۔ آج دُنیا کا کوئی دیرینہ مذہب (بجز اسلام) ایسا نہیں جس کی مذہبی کتاب یا تو بالکل نابود ہو گئی ہو یا پھر معتدبہ طور پر محرّف نہ ہو ۔ یہ فیصلہ ہمارا آج اس وقت کا نہیں ۔ توریت حضرت موسیٰؑ کی وفات کے دو سو برس بعد ہی سے بالکل اپنی صورت بدل چکی تھی ۔ زرتشت کی مذہبی کتاب (گاتھا) ان کی موت کے تین سو برس بعد ۱/۴ حصّہ اصلی حالت میں قائم تھی ۔ انجیل حضرت عیسیٰؑ کی "رفعت"

کے ڈھائی سو سال بعد سے محرف ہونا شروع ہو گئی تھی۔ لیکن خلاف اس کے قرآن مجید بجنسہٖ اُسی حالت میں موجود ہے۔ جس میں غیابت نبوی کے قبل تھا۔ دوسرا ثبوت خود قرآن مجید کا دعویٰ ہے کہ اسے اللہ نے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر رکھا ہے (۹/۱۰) علاوہ بریں آج دنیا میں قرآن مجید کی صدہا تفاسیر موجود ہیں۔ اگر خدانخواستہ خود متن قرآن کسی وجہ سے ضائع بھی ہو جائے تو اس کا دوسرا صحیح ایڈیشن فوراً تیار ہو سکتا ہے۔ پھر خدا ہمارے حُفّاظ کو سلامت رکھے جن کے سینے قرآن کے خزینے ہیں۔ یہاں تک تو بات معمولی تھی۔

اب اُس کی معنوی صورت کو لیجیے۔ قرآن کی معنوی خصوصیات تین ہیں:-

(۱) فلسفۂ قرآنیہ (۲) احکام قرآنیہ (۳) قصص قرآنیہ۔

مؤخرالذکر کو پہلے لیجیے، اس لیے کہ چند لفظوں میں اس کی توضیح ختم کی جا سکتی ہے۔

آج سے چند سال قبل تک مسیحی مصنفین قرآنی قصص کی تاریخی حیثیت کا مضحکہ اڑاتے تھے اور اپنی مذہبی کتابوں کا و نیز دیگر تاریخوں کا مقابلہ کر کے قرآن کی غلطیاں بتایا کرتے تھے۔ لیکن بحمداللہ روز بروز یہ حقیقت واضح تر ہوتی جاتی تھی کہ قرآنی روایات صحیح ہیں اور یہودیوں اور عیسائیوں کی روایتیں بالکل غلط۔[1]

(تلخیص نوٹ مولانا محمد علی مترجم قرآن)

احکام قرآنیہ کی متعدد قسمیں ہیں (۱) مذہبی - اخلاقی - معاشرتی - تعزیری

موقع و محل اس کی اجازت نہیں دیتا کہ میں ان کی خوبیاں بالتفصیل بیان کروں۔ اس لیے نہایت مختصر الفاظ میں مبصرین کی رائے اُن کی خوبیوں کی بابت و نیز اُن کے مستقبل کے متعلق عرض کرنا ضروری ہے۔

۱۔ تعزیری قوانین اسلام:-

ماہرین انسدادِ جرائم کا عجز مضحکہ خیز ہے۔ اس لیے کہ اُنھوں نے جو طریقے جرائم کے انسداد کے بنا رکھے ہیں وہ نہ صرف فضول ہیں بلکہ اُن سے جرائم میں

[1] فاضل مترجم نے اپنے ترجمے میں جا بجا اس کا ثبوت دیا ہے اور خود عیسائی مصنفین کا اقرار نقل کیا ہے۔

زیادتی ہو رہی ہے۔ اوّل تو قید خانوں کے اخراجات سے حکومت زیر بار ہوتی ہے۔ پھر قیدیوں میں بداخلاقی پختہ ہو جاتی ہے اور رہائی کے بعد ان کی پیشانیوں پر ایک قطرہ بھی خجالت کا نہیں رہتا۔ بعض کا خیال ہے کہ اسلامی اصول قطع برید و درّہ زنی وحشیانہ ہے لیکن یہی وہ طریقے ہیں جن سے جرائم بیخ و بنیاد سے اکھاڑ کر پھینکے جا سکتے ہیں۔ جرائم کی حیرت انگیز ترقی اور ماہرین انسداد جرائم کا عجز ہمیں یقین دلاتا ہے کہ ایک دن انھیں مفروضہ "وحشیانہ" طریقوں کو اختیار کرنا پڑے گا۔[۱]

۲۔ معاشرتی قوانین اسلام:۔

اسلامی قانونِ معاشرت کی بابت آج یورپ متفق ہے کہ یہی وہ ایک نظام ہے جس میں افراد و قوم دونوں کی زندگی کا لحاظ رکھا ہے۔ وان کریمر (مشہور جرمن مستشرق) نے تو اسلامی قانونِ وراثت کی بابت کہا ہے کہ "یہ دنیا کا نادرالوجود تحفہ ہے اور اس کا مستقبل صاف روشن ہے اور شریعتِ اسلامیہ کی نو ایجاد شاخ ہے۔"[۲]

۳۔ اسلامی اخلاقیات:۔

"اسلامی اخلاقیات کی سربلندی" بقول مولانا عبدالماجد "آسمان سے بھی پرے ہے۔ جس نظام اخلاق کی معیار رضائے الٰہی کی نیت ہو اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔"

یونانی اصول اخلاق بالکل ظاہرداری پر مبنی تھے۔ چنانچہ اسپارٹا کے قانون کے مطابق اگر چور مال مسروقہ کے ساتھ پکڑا جاتا تب تو وہ مجرم ٹھہرتا، ورنہ اگر صفائی سے بچ کر نکل گیا تو وہ قابل معافی تھا۔ رومن قانون صرف واقعات کی شہادت کو کافی سمجھتا۔ دنیا میں اسلام پہلا قانون حیات ہے جس نے "اِنَّمَا الاَعمَال

---

۱ "INCREASE IN CRIME" BY JOHN HOOPE. P. 7. (INTRODUCTION)

۲ یہ جملہ زیر خط علامہ اقبالؒ نے اپنے "جواب خط پنڈت نہرو" میں نقل کیا ہے (تقریرات و بیانات صفحہ ۱۴۰)

بالنّیات کا اصول زرّیں منضبط کیا۔ آج مشرق و مغرب کے تمامی قوانین اسی اصول پر مبنی ہیں۔ (آر۔ کے نریمان)[۱]

۴۔ مذہبی قوانین اسلامیہ:۔

بغرضِ اختصارِ بحث علامہ اقبالؒ کی پیش گوئی درج کی جاتی ہے جو ہر طرح قابلِ غور و خوض ہے خطبہ صدارت (آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقدہ لاہور بتاریخ ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء) میں اقوامِ مشرق کے مستقبل پر بحث کرتے ہوئے مسلمانوں کو اس طرح مخاطب فرماتے ہیں:۔

"وہ مذہب (جس کی آپ لوگ نیابت کر رہے ہیں) افراد کی قدر و قیمت کو تسلیم کرتا ہے، اور اسے اس طرح منظم کرتا ہے کہ وہ سب کچھ خدا اور انسان کی خدمت کے لیے دے دے۔ اس کے امکانات ابھی تک ختم نہیں ہوئے۔ یہ اب بھی ایک ایسی نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے جہاں انسان کی سماجی شخصیت اس کی ذات و رنگ اور آمدنی سے نہیں متعین کی جائے گی۔ بلکہ اس زندگی سے جانچی جائے گی جو وہ بسر کر سکتا ہے۔ جہاں غریب امیروں پر محصول عائد کرے گا۔ جہاں انسانی سوسائٹی شکمی مساوات پر نہیں بلکہ روحانی مساوات پر مبنی ہوگی۔ جہاں ایک اچھوت شاہزادی سے عقد کرے گا اور نجی ملکیت ایک امانت ہوگی اور جہاں سرمایہ دار کو اس لیے دولت جمع کرنے کا حق ہوگا کہ وہ اصل پیدا کنندہ دولت پر مستولی ہو جائے۔" تقریرات و بیانات صفحہ ۵۴/۵۵

انھیں خیالات کو "خضرِ راہ" و "طلوعِ اسلام" میں بھی بطرزِ شاعرانہ فرماتے ہیں:۔

تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

یہ نکتہ سرگزشتِ ملّتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا (طلوعِ اسلام)

[۱] مقدمہ قانون تعزیرات صفحہ ۱۷

مسلم خوابیدہ اُٹھ ہنگامہ آراء تو بھی ہو

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دَور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

مسلم ہستی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لا یُخلِفُ المیعَاد دار

(ب) کیا اسلام کوئی ایسا قانونِ زندگی پیش کرتا ہے جس کی کشش دوسروں کو جذب کر سکتی ہے ؟

اسلام نے جو روحِ حیات پیش کی تھی اگر خلفائے راشدین کے بعد بھی اُسے قائم رکھنے کی کوشش قائم رہتی تو آج ساری دنیا میں اسلام ہی کا دَور دورہ ہوتا۔ لیکن بُرا ہو سلاطین اور اُن کے سازشی ہمنوا علماء سُوء کا جنھوں نے اپنی غیر اسلامی، خودغرضیوں سے ملّتِ بیضاء کو اس درجہ روسیاہ بنایا کہ

کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے
سُکر کی لذت میں وہ لٹوا گیا نقدِ حیات

اگر مسلمان سلاطین نے فتوحات و حکمرانیاں ہی اپنے مقاصد نہ رکھے ہوئے ہوتے اور علماء کی اعانت سے تبلیغ اسلام بھی جاری رکھی ہوتی تو آج دُنیا میں اسلام ہی کا بول بالا ہوتا۔

بایں ہمہ بقول لین پول اسلام کی کشش ہمیشہ اپنے جانی دشمنوں کو بھی اپنا دوست بنائے رہی۔ یہی وہ راز ہے جس نے اسلام کو کلیتاً فنا ہونے سے ہمیشہ بچا لیا۔ ان اقوام کے علاوہ جنھیں ہمارے فاتحانہ اثرات نے حلقہ بگوش اسلام بنایا (مثلاً بربر۔ ایرانی۔ خرزی۔ ترکی وغیرہ وغیرہ) آپ کو تاریخ اسلام میں مغل، ترک و کنامی (افریقی) اقوام کی بھی مثالیں ملیں گی۔ جو بلا جبر و اکراہ مسلمان ہوئے اور اس وقت اسلام قبول کیا۔ جب اُن حصص ممالک میں اسلام فنا کے گھاٹ اُترنے والا تھا۔

تبلیغ اسلام کی طرف سے بے اعتنائیوں کو دیکھتے ہوئے افریقہ میں "یدخلون فی دین اللہ افواجا" کا منظر معجزہ سے کم نہیں۔ میں آپ کے سامنے دو عیسائی مبلغین کی رپورٹوں کے مختصر اقتباسات پیش کرتا ہوں جنھوں نے ایشیا و افریقہ میں اربوں روپے تبلیغ مسیحیت میں صرف کیے۔ اوّل الذکر غالباً مبلغ سے زیادہ جاسوس و سیاسی

ترجمہ:۔ تو مسلمان ہے اس لئے اپنے سینہ کو آرزوئے (کرم) سے آباد رکھ اور ہر وقت اپنے پیش نظر، عدہ الٰہی متعلقہ آیت کہ بے شک اللہ کبھی خلاف وعدہ نہ کرے گا (عمران رکوع ۱ آیت ۸)

نغمۂ عشرت بھی اپنا نالۂ ماتم میں ہے

ریشہ دوان تھا

سنہ ۱۸۰۰ئہ ۱

محمدؐ کی اُمّت ختم ہو چکی، فطرت کے نزدیک اس کا مقصودِ تخلیق مکمل ہو چکا۔ خانہ جنگی۔ جہل و عیش پرستی اس کا شعار ہے۔ سیاسیات میں اس نے وہ مات کھائی ہے کہ اب اس کا کوئی مستقبل نہیں۔ اب عیسائیت ہی کا دور دورہ ہوگا۔

(برٹن۔ اقتباس از کرسچین میگزین۔ امریکہ)

سنہ ۱۹۰۰ئہ

اسلام نہ صرف سخت جان ہے بلکہ اس کی سادگی اور مساوات بین المسلمین ایسی دلکش خصوصیات ہیں کہ ہم باوجود کروڑ ہا روپیہ صرف کرنے کے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ افسوس تو اس کا ہے کہ وہ وحشی اقوام جنھیں ہم صرف کثیر سے عیسائی بناتے ہیں وہ کسی وقت بغیر لالچ کے مسلمان ہوتی جاتی ہیں۔

(کرک پیٹرک۔ ایضاً)

۴۔ اب اس باب میں علامہ اقبالؒ کے خیالاتِ زرّیں ملاحظہ ہوں:۔

اسلامی تاریخ سے میں نے ایک سبق حاصل کیا ہے:۔

"اُن کی تاریخ کے نازک موقعوں پر مذہب اسلام ہی نے مسلمانوں کو نجات دلائی ہے۔ مسلمان کبھی اسلام کے آڑے نہیں آئے۔

اگر آج تم اپنے خیالات کو اسلام پر مرکوز کر لو اور اُس کے ہر آن زندگی بخش تخیلات سے مستفید ہو جاؤ تو تم اپنے شیرازۂ پریشاں کو دوبارہ مجتمع کر لوگے اور اس طرح اپنی کھوئی ہوئی ساکھ کو دوبارہ حاصل کر لوگے اور خود کو بالکل فنا ہونے سے بچا لوگے۔ تقریرات صفحہ ۳۶

---

۱ علامہ اقبالؒ کی مؤرخانہ بصارت کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ آپ نے "خط بنام پنڈت نہرو" (تقریرات ص۱۲۴) میں سنہ ۱۷۹۹ئہ کو دُنیائے اسلام کے انحطاط کا حقیق بتایا ہے۔" لیکن جس طرح جرمن قوم نے دوبارہ جنم لیا اسی طرح اس سیاسی ذلت و انحطاط کے بعد اسلام نے بھی کروٹ بدلی۔"

نشتریں تو "پاسبانِ عقل" حزم و احتیاط پر مجبور کرتی رہی اس لیے صرف یہ سنا کر خاموش ہو رہے کہ

"تاریخ اسلام بتا رہی ہے کہ اسلام ضرور تمہاری اعانت کرے گا۔"

لیکن جب شاعرانہ جذبات نے قلب و دماغ میں ہیجانات پیدا کیے تو ایک ملہمانہ انداز میں فرماتے ہیں:۔

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے — شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا — خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا

کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا (بانگ درا)

(ج) کیا اسلام کا ضابطۂ حیات ایک عامیانہ تخیل عروج پیش کرتا ہے یا اسلام ارفع و اعلیٰ جو منتہی خیال انسانی ہو؟
غالباً اس عذر کی تکرار بے جا نہیں کہ بحث کی تنگی ان لطیف نکتوں کو بالاختصار بیان کرنے پر مجبور کر رہی ہے:۔ اسلام نے انسانی عروج و ترقی کا لبِ لباب اس آیۂ کریمہ میں بیان فرمایا ہے:۔

"خدا نے آفتاب و ماہتاب کو تمہارا فرمانبردار بنایا ہے۔" (۱۴/۳۳)

اب اس سے زائد انسانی عظمت کیا ہو سکتی ہے۔ آج بھی اس دُنیا کے کروڑہا انسان چاند و سورج کو معبود سمجھ کر اُن کی پرستش کر رہے ہیں۔ لیکن ایک مسلمان کو یہ خوش خبری دی جا رہی ہے کہ

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں (جوابِ شکوہ)

کیا ایسے اہلِ مذہب جن کا معیارِ حیات اس درجہ بلند ہو وہ دنیا میں ذلیل رہ سکتے ہیں؟
علامہ اقبالؒ کو اسلام کی موجودہ کشمکشِ حیات ہی میں مسلمانوں کی عالمگیر ترقی کی دھندلی سی تصویر نظر آ رہی ہے:۔

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا — سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آ بسیں گے — برہنہ پائی وہی رہے گی مگر نیا خار زار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا — سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

؎ کیا یہ پاکستان میں مہاجرین کی آمد اور اُن کے نئے وطن کی طرف لطیف اشارہ نہیں ہے؟

بے چاری کلی کھلتی ہے مرجھانے کی خاطر

لیکن سب سے اہم سوال یہ ہے کہ آیا یہ پیش گوئی صرف اُس "بے معنی خواہش" پر مبنی ہے جو ایک حامی قوم کے دل میں پیدا ہوتی ہے یا اس کی بنا پر کوئی قابل اعتنا دلیل بھی ہے۔ خصوصاً جب

اے ہوس خوں رو! کہ ہے یہ زندگی بے اعتبار — یہ شرارے کا تبسم، یہ خسِ آتش سوار
زندگی اقوام کی بھی ہے یونہی بے اعتبار — رنگ ہائے رفتہ کی تصویر ہے اُن کی بہار

ہے نگینِ دہر کی زینت ہمیشہ نامِ نو
مادرِ گیتی رہی ہے بستنِ اقوامِ نو

آہ! مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا — آسماں سے ابرِ آزادی اُٹھا برسا گیا

(گورستانِ شاہی بانگِ درا)

اس تلخ حقیقت کے بعد کبھی بھی بغیر منطقی دلیل اس پیش گوئی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں:۔

ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

مسلمانوں کے روشن مستقبل پر عاقلانہ و محققانہ دلائل

مشہور فلسفی ہنری برگسان کا خیال ہے کہ:۔

"یہ ساری کائنات کی مثال ایسی ہے، جیسے کہ ایک بہترین انسانی شاہکار جس کا ہر جزو ایک دوسرے سے وابستہ اور جس کی ہر آواز باجہ کی آواز کی طرح دوسری آواز سے ہم آہنگ، اگر کہیں اختلاف نظر بھی آئے گا تو اس کا رجحان اتحاد کی طرف ہوگا۔" CREATIRE EROLUTION P.133-4.

یہی وہ اتحاد ہے جو اسلامی نظریہ توحید باری کا موید ہے۔

آگے چل کر یہی قابل مصنف اس کائنات میں ایک ایسی زبردست مخالف طاقت کا پتہ دیتا ہے جو محرک ارتقا تو ضرور ہے لیکن وہ ہمہ وقت "روح متحدہ کائنات" سے برسرِ پیکار رہتی ہے۔ عموماً اس جنگ کا نتیجہ موخر الذکر کے

حق میں ہوتا ہے۔ لیکن تاہم اصولی اختلافات میں "روحِ متحدہ" ہی کو فتح نصیب ہوتی ہے۔

اس نظریہ کا دوسرے بہت بڑے موید ڈی ہاگ (DE HOGG) کا اعتقاد ہے کہ یہ جنگ اُس مشقیہ قواعد کی مانند ہوتی ہے جس میں اوّل الذکر کی حیثیت مخاصم و حریف کی نہیں ہے۔ بلکہ اس پہلوان کی ہے جو اپنے شاگردوں سے انھیں داؤ پیچ سکھانے یا چست و چالاک بنانے کے لیے نبرد آزما ہوتا ہے۔

علامہ اقبالؒ اسی کشاکش کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں :۔

نقش کی ناپائداری سے عیاں کچھ اور ہے

موجِ مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب جنتِ نظارہ ہے نقش ہوا بالائے آب
موج کے دامن میں پھر اس کو چھپا دیتی ہے وہ کتنی بیدردی سے نقش اس کا مٹا دیتی ہے وہ
اس روش کا کیا اثر ہے ہیئتِ تعمیر پر یہ تو حجت ہے ہوا کی قوتِ تعمیر پر

فطرتِ ہستی شہیدِ آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو

اسلامی نظریہ ڈی ہاگ کے اعتقاد سے کسی قدر مختلف ہے۔ یہاں اصل کشمکش حق و ناحق میں ہے۔

جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا (۸۱/۱۷)

حق آگیا اور باطل غائب ہوگیا بے شک باطل جانے والا ہی ہے

لیکن اس ساری کشمکش کا اصلی مقصود کیا ہے ؟ اس کا جواب شائد مغربی دماغ دینے سے معذور ہے۔ وہ کشمکش دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک کبھی تو اس کی حیثیت جنگِ زرگری کی ہوتی ہے اور کبھی نبردِ خصمانہ۔ لیکن وہ اس کے اصلی راز سے اب تک ناواقف ہے۔

مقصدِ حیاتِ عالم اتمامِ توحید ہے

قرآن کریم فرماتا ہے کہ "میں نے اس دنیا کو کھیل تماشے کے لیے نہیں بنایا۔" (۴۴/۳۸) اس مقصد کے حصول کے لیے، خواہ وہ جو بھی ہو، حق و ناحق کی جنگ قائم کی (۳۶/۳۱) لیکن حق کو کبھی ناحق کے ہاتھوں

میں مجبور و معذور بھی نہیں چھوڑا (۲/۲۵۰) بلکہ جس طرح ایک ہوشیار سپہ سالار باغیوں کو ہر چہار طرف سے گھیر کر ایک مرکز پر لا کر فنا کرتا ہے۔ اُسی طرح وہ نامعلوم قوت اور اس کی افواج قاہرہ ناحق کو گھیرتی ہوئی دباتی چلی آرہی ہیں (۲۱/۴۴) تاریخی انقلاب بھی صاف بتا رہے ہیں کہ

۱۔ ؏ ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے

۲۔ ؏ ہے پسِ پردۂ گردوں ابھی دَور اور بھی

یہ بھی اشارتاً فرمایا کہ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ (۲۱/۹۳) اور انجام کار کی طرف اس قدر ایمائی کنایہ بھی کافی سمجھا گیا کہ "اس دن آنکھوں سے پردے اس طرح ہٹ جائیں گے کہ ٹھوس حقیقت واضح ہو جائے گی (۵۰/۲۲)

اس صغریٰ و کبریٰ کے بعد شاید اس نتیجہ کو اخذ کرنے میں عقل کو ذرہ برابر بھی عذر نہ ہوگا کہ وہ مقصود

اتمام توحید باری تعالےٰ ہے

فرمایا رسول اللہ صلعم نے کہ "قیامت میں تم اس طرح خدا کو دیکھو گے جس طرح بدر کامل کو۔

اب یہ تو ظاہر ہے کہ ؏ "نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے۔" اور یہ ناگزیر ہے۔ ایسی حالت میں یہ سوال رہ جاتا ہے کہ کیا "فطرت وحدہ" قانون اسلام کو منسوخ کر کے دوسرا قانون بنائے گی۔ جس سے اتمام توحید مکمل ہو یا قرآن مجید کافی ہے۔ یہ تو سہل تسلیم ہے کہ

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے دل خوگر ہیں	اُمتی باعثِ رسوائیِ پیغمبر ہیں
بُت شکن اُٹھ گئے باقی جو رہے بُت گر ہیں	تھا براہیم پدر، اور پسر آذر ہیں

بادہ آشام نئے، بادہ نیا خم بھی نئے

حرم کعبہ نیا، بُت بھی نیا، تم بھی نئے

لیکن جب ؏ "ہے ابھی باقی مگر شانِ جمالی کا ظہور" اُس وقت فطرت اس مقصودِ حیات کی تکمیل کے لیے کسے منتخب فرمائے گی۔ آئیے آپ اس سوال کا جواب بھی مقنن حقیقی ہی کی زبان سے سنیئے۔

قرآن تو ابدی قانونِ حیات ہے (۱۵/۹) اور اسلام دنیا کا آخری مذہب ہے۔

اس لیے نہ کوئی دوسرا نبیؐ آسکتا ہے' اور نہ کوئی دوسرا مذہب' اور نہ کوئی دوسرا قرآن مگر خدا کو اتمام توحید لازم ہے۔ اس لیے کہ یہی مقصودِ حیات ہے۔ ایسی حالت میں اگر ہم آپ پاکستانی' ایرانی' عربی یا مصری مسلمان اس مقصود کے حصول میں سعئ بلیغ سے گریز کریں گے تو

خدا تمھاری جگہ پر دوسری قوم کو پیدا کر دے گا جو تمھاری طرح بے پروا نہ ہوگی (۴۷/۳۸)

علامہ اقبالؒ گو اس کے معتقد ہیں کہ ع "نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے" اور یہ بھی امید رکھتے ہیں کہ ع "ہے ابھی باقی مگر شانِ جمالی کا ظہور"۔ لیکن وہ قوم کون ہوگی جس سے (لیا جائے گا تم سے کام دنیا کی امامت کا) اس کی بابت بالکل خاموش ہیں۔ اس لیے ہمیں بھی خاموش ہی رہنا بہتر ہے۔ اب اقوام اسلامیہ اپنے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر خود دیکھیں کہ آیا وہ معیارِ امامت پر صحیح اترتی ہیں یا نہیں۔

(د) کیا مسلمانوں کے قانونِ حیات میں معتقدین اسلام کے بکھرے ہوئے شیرازوں کو ایک مرکز پر مجتمع کرنے کی صلاحیت ہے؟

آج دنیا کی ہر قوم و ہر جماعت اپنے اپنے افراد کو ایک مرکزِ مشترک پر لانے کی کوشش کر رہی ہے۔ جن قوموں میں کوئی مفاد مشترک موجود نہیں وہ اس کی اختراع میں مصروف ہیں۔ لیکن خود اُن کا اصل مذہب کسی ایسے مرکز کا پتہ نہیں دیتا جس پر ان کے افراد جمع کیے جا سکیں۔ یہ نکتہ کس قدر باریک ہے۔ اس لیے توضیح کا محتاج ہے۔ کسی قوم کے افراد میں اشتراک متعدد صورتوں میں پیدا ہوتا ہے۔ (۱) اشتراکِ مقصود (۲) اشتراکِ ایمانی (۳) اشتراکِ عملی (۴) اشتراکِ انجام:۔ ملتِ بیضا ہی وہ تنہا جماعت ہے جس کے ہر فرد تمامی حیثیات سے مشترکہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ رضائے الٰہی ہر مسلمان کا مقصود ہے۔ کلمہ طیبہ ہر مسلمان کا ایمان ہے۔ فرائضِ خمسہ ہر مسلمان کا معمول ہے۔ حشر و نشر و شفاعت ہر مسلمان کا انجام ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر کوئی ملت اسبابِ ربط و اتحاد پیش کر سکتی ہے۔ خدا و رسول کے نام پر مراکش سے لے کر ملایا تک ایک مرکز پر جمع کیے جا سکتے ہیں۔

اس مسئلہ کا ایک لطیف پہلو بھی قابلِ لحاظ ہے:۔ قرآن کریم ایسا قانونِ حیات پیش کرتا ہے کہ اسلام کے باغی بھی اسلام کی گود میں دوبارہ بلائے جا سکتے ہیں۔ آج وسط ایشیا کی اسلامی سلطنتیں اشتراکی معتقدات کی حامل ہیں۔

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے

کاش اُن سے کوئی یہ بتا دے کہ

الحاد اصل اشتراکیت نہیں۔ اصل اشتراکیت تو یہ ہے کہ "خدا نے تمہیں ایک دوسرے پر فوقیت دی ہے۔ تاکہ تم اپنے ماتحتوں میں اپنی دولت کو برابر برابر تقسیم کرو"

(۱۶/۷۱ قرآن مجید)

علامہ اقبالؒ کی اشتراکیت کی بابت جو پیش گوئی ہے وہ مناسب موقع پر درج کی جائے گی۔ یہاں صرف اُن کا ایک شعر حاضر ہے ؎

آیدش روزے کہ از زورِ جنوں ۔۔۔ خویش را از تند باد آرد بروں

(ایک روز آنے والا ہے جب اشتراکیت اپنے جوش میں آکر اس طوفان سے باہر آجائے گی)

کیا ہم اپنے بچھڑے ہوئے بخاری و خوارزمی بھائیوں سے ایک دن ملنے کی امید نہ رکھیں؟

علامہ اقبالؒ اسی اتحاد بین الاسلامی کی خوش خبری دیتے ہیں:۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش ۔۔۔ اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

اس قدر ہوگی ترنّم آفریں بادِ بہار ۔۔۔ نکہتِ خوابیدہ غنچہ کی نوا ہو جائے گی

آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک ۔۔۔ بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی

شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز ۔۔۔ اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی

پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

(بانگِ درا)

باب ششم

ملّتِ اسلامیہ (۲)

(پیوستہ)

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قُدسیوں سے مَیں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

اس مقالہ میں ملّتِ اسلامیہ کے مستقبل پر بحث جاری رکھتے ہوئے مستقبل ملّت کا اندازہ اُس کی تاریخ سے کیا گیا ہے۔ بذریعہ نقشہ جات یہ دکھایا گیا ہے کہ ملّتِ اسلامیہ ایک لافانی جماعت ہے۔ اُس کی نشاۃ ثانیہ بہت ہی اعظم الشان مستقبل کا پتہ دیتی ہے۔ بطور ثبوت متعدد اسناد بالخصوص اقوالِ اقبالؒ پیش کئے گئے ہیں۔

تحلیلِ مضامین

۱۔ قومی ترقی میں دو قوتوں کی کارفرمائی :۔ اندرونی و بیرونی۔

۲۔ اسلام میں تاریخ کا مفہوم :۔ تکرارِ تاریخی۔ نقشہ تحریکات کوچک تاریخ ہند۔ عِبر و بصائر۔ محمد (بن قاسم) اور محمد علی (جناح) میں مماثلت۔ انقلاباتِ عالم کی توجیہہ۔

۳۔ مسلمانوں کے جنگی کارناموں سے ملّتِ بیضا کے مستقبل کا پتہ۔

جنگِ بدر۔ مسلمانوں کی فتوحات و شکستیں اور ان کے اسباب و نتائج۔ نقشہ جات فتوحاتِ اسلامیہ۔ یا برکا واقعہ۔ آنے والی عظیم الشان جنگ اور مسلمان۔ مسلمان شکستوں سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ اقبال کے خیالات۔

بابِ ششم

ملّتِ اسلامیہ (پیوستہ)

اس زیاں خانہ میں کوئی ملّتِ گردوں وقار
رہ نہیں سکتی ابد تک بارِ دوشِ روزگار

اس قدر قوموں کی بربادی سے ہے خوگر جہاں
دیکھتا بے اعتنائی سے ہے یہ منظر جہاں

آہ مسلم بھی زمانہ سے یونہی رخصت ہوا

ہیں ابھی صدہا گہر اس ابر کی آغوش میں
برق ابھی باقی ہے اس کے سینۂ خاموش میں

ماضیِ ملّت سے مستقبلِ ملّت کا اندازہ

ع آغازِ زیست پرتوِ انجامِ زیست ہے

(الف) ا۔ **تمہید:۔** ہر قوم دو قوتوں سے زندہ رہتی ہے۔ ایک اندرونی اور دوسری بیرونی۔ اندرونی قویٰ کی پرورش اُس صلاحیت سے ہوتی ہے جو قوانینِ فطرت نے اسے ودیعت فرمائے ہیں جن میں نشاۃ اولیٰ کی خصوصیات گرد و پیش، تنازع للبقاء وغیرہ وغیرہ خاص کر قابلِ لحاظ ہیں۔ بحمد اللہ جہاں تک اس مختصر رسالہ کی وسعت نے اجازت دی۔ اُس حد تک اس پر کافی روشنی ڈال چکا ہوں۔ گو مضمون سچ پوچھیے تو تشنہ ہے۔ لیکن جہاں تک بیان کیا گیا ہے۔ وہ نفسِ مضمون کے سمجھنے کے لیے کافی ہے۔

بیرونی قوتِ قویٰ زیادہ تر تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے امکانات کا صحیح اندازہ ملّت کی تاریخ کے مطالعہ ہی سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم یا ملّت اسلام سے زیادہ دلچسپ و

عبرت انگیز و سبق آموز تاریخ ماضی نہیں پیش کر سکتی ۔ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ اسلام تاریخ کا پہلا اور آخری مذہب ہے ۔ میں تو اس جسارت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوں کہ اسلام تاریخ عالم ہے اور تاریخ عالم اسلام ۔

۲ ۔ اسلام میں تاریخ کا مفہوم :۔

سرزند از ماضیِ تو حالِ تو　　　　خیزد از حالِ تو استقبالِ تو
مشکن ار خواہی حیاتِ لازوال　　　　رشتۂ ماضی ز استقبال و حال　　(اقبالؒ)

افسوس کہ آج اسلام کے کارناموں میں صرف نماز روزہ و حج و زکواۃ ہی کا شمار باقی رہ گیا ہے یوں تو اس محیر العقول نصاب ِ حیات کے بے شمار کارنامے ہیں ۔ لیکن اُن میں "تاریخی حس کی تخلیق" شاہکار ہے ۔

> اسلام سے قبل دنیا "تاریخ" کے مفہوم سے ناواقف تھی ۔ یونانیوں سے قبل کے مورخین میں بعض اپنے سورماؤں کے کارنامے اور اپنے بادشاہوں کی فتوحات بیان کرتے اور اس قسم کے لغو ادب کو "تاریخ" کہتے[۲]
>
> یونانیوں نے تاریخ نویسی میں اسباب و علل کی بحث ضرور شامل کی، لیکن چونکہ وہ دنیا کو محدود سمجھتے اور ان کے نزدیک زندگی کا کوئی مقصود نہ تھا ۔ اس لیے وہ تاریخی تسلسل سے ناواقف تھے ۔ چونکہ وہ زندگی کو مدور سمجھتے تھے اس لیے "تاریخی تکرار" کا تو انھیں حس ہوا ۔ لیکن وہ اس حرکت زمانی سے ناشناس تھے جو گزشتہ واقعات کو نئی صورت میں پیش کرتی رہتی ہے ۔ اس لیے کہ (جیسا بیان کیا جا چکا ہے) اُن کے

---

[۱] میں نے اس مسئلہ پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ مقدمہ "تاریخ اسلام" میں بحث کی ہے [۲] گاڈ پر (GORDEN. 139)

سینۂ بلبل کے زنداں سے سرود آزاد ہے

نزدیک نہ زندگانی کا کوئی مقصود تھا اور نہ کوئی اس کی غایت تھی (TL INT, R.S)

اسلام نے ایک طرف :-

تلک الایام نداولها بین الناس (۳/۱۳۹)

ہم ان انقلابات کو باری باری انسان پلاتے رہتے ہیں

کا اصول بتا کر "تاریخی تکرار" کے اصول پر مہر تصدیق ثبت کر دی ۔ دوسری طرف تاریخ کو بصائر الناس (۳/) بنایا ۔ پھر تحصیل مقصد میں فطرت کی کارفرمائیوں کا اس طرح ذکر کیا کہ وہ ہر چہار طرف سے زمینوں کو دباتی اور دشمنان فطرت کو گھیرتی چلی آ رہی ہے ۔(۲۱/۴۴) اور آخر میں انجام حیات بھی بتا دیا کہ کلٌّ الینا راجعون (۲۱/۹۳) اس نصاب عمل کو دیکھتے ہوئے "تاریخی تکرار" کی اہمیت کا اندازہ ناممکن ہے ۔ اس لیے کہ گزشتہ واقعات بعینہٖ اپنی تفصیلات و افراد و مقامات کے ساتھ مکرر وقوع پذیر نہیں ہوتے ۔ بلکہ ان کی تکرار اصولی ہوتی ہے ۔ پھر ہر نئی تکرار گزشتہ واقعات کی تفسیر ہوتی ہے ۔ کبھی ماضی کی خامیاں و نقائص نئی صورتوں میں آتے ہیں اور کبھی اپنے ساتھ نئی مشکلات و نئے مسائل پیدا کرتے ہیں ۔

ممکن ہے کہ دیگر ممالک اسلامیہ کی تاریخ سے آپ کو دلچسپی کم ہو ۔ اس لیے میں ہندوستان کی تاریخ کے اہم واقعات پیش کر کے مسئلہ زیر بحث کی توضیح کروں گا ۔

اب آپ تھوڑی دیر کے لئے صفحہ ۱۰۰ کے نقشہ پر سرسری نظر ڈالیں :-

مختلف ہر منزلِ ہستی کی رسم و راہ ہے

نقشہ تحریکات کوچک تاریخِ ہند

نمبر شمار	سنوات عیسوی	عہود	قطعات مفتوحہ	کیفیت
۱	۷۱۱ لغایت ۷۲۰	محمد بن قاسم	سندھ و ملتان تا حدود لاہور	پچاس برس کے اندر ہی جو انتشار پیدا ہوا اس سے مسلمانوں کا تسلط برائے نام رہا۔
۲	۱۰۱۰ لغایت ۱۰۳۰	محمود غزنوی	+ دلّی و قنوج تا کالنجر	یہ پہلی تحریک کل ہندوستان پر تسلط جمانے کی تھی۔
۳	۱۱۷۵ لغایت ۱۲۰۶	محمد غوری	+ بہار۔ گجرات۔ بنگال	
۴	۱۲۹۴ لغایت ۱۳۱۰	علاؤالدین خلجی	+ راجپوتانہ + دکن تا مدورا	
۵	۱۳۱۰ لغایت ۱۷۰۷	تغلق و سادات و لودھی و مغول	+ کشمیر + تمامی برِاعظم کوچک پر تسلط	یہ عہد اورنگ زیب پر ختم ہوتا ہے۔ اس درمیان میں گو مختلف چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ لیکن مجموعی طور پر حکومت مسلمانوں ہی کی قائم رہی۔

۱۔ سندھ و ملتان کی فتح کے بعد تین سو برس تک جمود و سکون (۷۱۱ — ۱۰۱۰)

۲۔ کل ہندوستان پر تین سو برس میں قبضہ و تسلط (۱۰۱۰ — ۱۳۱۰)

---

[۱] ماہرین فلسفۂ تاریخ نے قومی تاریخ کی دو قسمیں کی ہیں (۱) تحریک نشاۃ (۲) تحریکات کوچک۔ اول الذکر کے دو دور قرار دیے ہیں۔ الف نشاۃ اولیٰ (ب) نشاۃ ثانیہ۔ باقی رہی تحریکات کوچک یہ تو قوم کی اس قوتِ مخفی پر منحصر ہے جو ابھرنے کے لیے ہر وقت بے چین رہتی ہے۔ بعض قوموں میں یہ تحریکات اکا دکا رونما ہوتی ہیں اور بعض اقوام میں بار بار اور بکثرت یہاں تک کہ بقول اقبالؔ ع پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ

۳ - کل ہندوستان پر چار سو برس تک تسلط و اقتدار (۱۳۱۰ - ۱۷۰۷)
۴ - اضمحلال و انتشار کامل ڈیڑھ سو برس میں (۱۷۰۷ - ۱۸۵۷)
۵ - تقریباً سو سال تک جمود و انتشار (۱۸۵۷ - ۱۹۴۷)

عبر و بصائر

علامہ اقبالؒ نے ذرائع علوم کو تین حصوں میں تقسیم فرمایا ہے (۱) انفس (۲) آفاق (تاریخ) اور (۳) فضائے قدرت - لیکن یہ تینوں "زمین و مکان" (TIME - SPACE) کی شاخیں ہیں - اور اس زمان و مکان کی بہترین تفسیر "تاریخ" (HISTORY) ہے - اسلام سے قبل اور اسلام کے بعد بھی تاحال تمام قوموں نے تاریخ کو ایک فن قرار دیا ہے - لیکن اسلام اسے حکمت[1] بتاتا ہے (APPLIED KNOWLEDGE) اس لیے جس طرح اور حکمی علوم (مثلاً حساب و نجوم وغیرہ) سے متیقن نتائج اخذ کیے جاتے ہیں اسی طرح ایک متبصر تاریخ سے ہی صحیح نتائج نکال سکتا ہے - کیا ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ (جس کا ایک نہایت مختصر خاکہ اوپر دیا جاچکا ہے) سے حسب ذیل نتائج نہیں برآمد ہوتے ؟

۱ - وہ فتوحات ملکی جن کا نصب العین مندرجہ آیۂ کریمہ نہ ہو -

"کفار سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ مٹ جائے اور خدا کی حکومت قائم ہو۔" (الانفعال آیۃ ۳۹)

وہ پائدار نہیں ہوتی - آج گھر گھرا کر ہم پھر تقریباً وہیں پہنچ گئے جہاں محمد بن قاسم (رحمۃ اللہ علیہ) نے ہمیں چھوڑا تھا اور ہر پھر کر ہم انھیں

---

[1] ملاحظہ ہو آیات قرآنیہ (المائدہ ۱۱۰ - نساء ۱۱۳ - عمران ۴۹) جہاں "کتاب والحکمۃ" فرمایا ہے - یعنی علم اور اس کا انطباق سورۂ انبیاء میں اس کی توضیح فرمادی ہے - حکما و علماء (آیۃ ۷۵)

فغان نیم شب شاعر کی بار گوش ہوتی ہے

حدود میں محدود ہو گئے جس کی فتح خلوص پر مبنی تھی اور جہاں بعد فتح تمامی نظام حکومت متشرع رہا۔ رعایا کے ساتھ اچھا سلوک رہا۔ اشاعت اسلام کا خاص اہتمام اور مساجد تعمیر ہوئیں اور اُن میں نماز پابندی کے ساتھ پڑھی گئی۔"[۱]

۲۔ اور وہ حصص ملک جن کی فتوحات خلوص پر مبنی نہ تھیں وہ ہاتھوں سے چٹکی بجاتے نکل گئے۔ "گویا ہم وہاں تھے ہی نہیں" اور خدا نے بفحوائے آیۃ کریمہ

"کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم کس طرح زمینوں پر قابض
ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ہر طرف سے اُس کو
گھیرتے ہوئے آ رہے ہیں" (۲۱/۲۴)

ہمیں ہر چہار طرف سے ہانک کر پھر اسی مرکز پر پہنچا دیا[۲]

ہندوستان میں ہماری نشاۃ اولیٰ کا بانی محمد (بن قاسم) تھا۔ بفضلہٖ اسی کا ہم نام محمد (علی جناح) ہماری نشاۃ ثانیہ کا بانی ثابت ہوا۔

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میری نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

علامہ اقبالؒ ان تمامی درمیانی انقلابات کی نہایت لطیف توجیہ فرماتے ہیں۔ جس سے ہمارے مستقبل کا بھی پتہ چلتا ہے:۔

جنتِ نظارہ ہے نقشِ ہوا بالائے آب ۔۔۔ موجِ مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب

---

[۱] تاریخ سندھ۔ مصنفہ ابوظفر ندوی [۲] افسوس ہے کہ پاکستان کے دور افتادہ قطعہ (مشرقی بنگال) سے مجھے کوئی خاص امیدیں وابستہ نہیں۔ اس کی توضیح بے محل ہے۔

آہ! شودر کے لیے ہندوستاں غم خانہ ہے

پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا
توڑنے میں اس کے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا

اس روش کا کیا اثر ہے ہیئتِ تعمیر پر
یہ تو حجت ہے ہوا کی قوتِ تعمیر پر

فطرتِ ہستی شہیدِ آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو

اس درمیان میں جو کچھ ہوا۔ خواہ وہ نادر شاہ کا قتل عام (۱۷۳۸ء) یا مسلمانوں کی ناکام انقلابی تحریک (۱۸۵۷ء) جس میں لاکھوں مسلمان شہید ہوئے۔ یا پھر دلی و دیگر شہروں میں بے گناہ مسلمان بوڑھے، بچے اور عورتوں کا قتل عام (۱۹۴۷ء) ہوا یہ سب اُسی تاریخی تکرار کی تکمیل کے لیے جس کے لیے "فطرتِ ہستی برابر شہید آرزو رہی تاکہ اس کی جستجو سے خوب تر پیکر برآمد ہو۔" باقی رہا نقصان جان و مال، اس کی بابت خدا کا حکم ملاحظہ ہو۔ اور یہ اس ذاتِ اقدس کی بابت ہے جس کی روح باعثِ تخلیق عالم ہے:۔

"محمدؐ کی ذات (بالمقابل روح) ایک رسول کی ہے، بہت سے رسول
ان سے پہلے گزر گئے۔ اِس لیے اگر وہ وفات پائیں یا مقتول ہوں
تو کیا تم اپنے پاؤں پر حق سے واپس پھر جاؤ گے۔ (عمران۔ آیۃ ۱۴۳)

وہ قوم جو علمبردارِ توحید بنا کر کھڑی کی جانے والی ہے اُس کے راستہ میں (بقول اقبالؒ)

زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں، آلام ہیں
کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں

اس لئے کہ ع خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اب یہ بہت بڑا سوال رہا جاتا ہے۔ جس پر پھر ایک اصولی بحث قائم ہوتی ہے۔
کیا تاریخی تکرار، یا قوم کا دوبارہ سمٹ سمٹا کر ایک جگہ مجتمع ہونا کسی مرکز کی تلاش کا پتہ دیتا ہے۔
اور کیا یہ مرکز، مرکزِ سابق کے مطابق ہے! نیز اس کی مقامی حیثیت اس کی نشاۃ ثانیہ میں کیا ہوگی؟

اور اس کے مستقبل کے ارادوں پر اس سے کیا روشنی پڑتی ہے؟

اگر آپ پاکستان اور اس کے حدود و قیام پر نظر ڈالیں تو ان میں سے بیشتر سوالات کے جوابات خود بخود نکل آئیں گے۔ برّاعظم کو حیک کا مسلمان جب "خوب تر پیکر کی جستجو" میں تھا وہ مرکز تھا۔ بحمدہٗ ہم اسی مرکز پر پہنچ گئے جہاں سے چلے تھے۔ اس لیے اگر ہم دوبارہ نکلیں گے تو گزشتہ تاریخی تجربات کا بوجھ ہماری گردنوں پر ہوگا اور اس وقت ہم کبھی ان غلطیوں کی تکرار نہیں کریں گے۔

ع خیزد از حالِ تو استقبالِ تو

پاکستان کی مقامی حیثیت نہایت باموقع ہے (STRATGIC) دُنیائے اسلام ہماری پشت پر ہے۔ حکومت نے اتحاد بین المسلمین کی تحریک اٹھائی ہے۔ وہ ہمارے مستقبل کے ارادوں میں معین ہوگی۔ اس بارہ میں اقبال کی پیش گوئی ملاحظہ ہو:-

سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر وہ دریا کے پار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

(انشاء اللہ المستعان)

(ب) مُسلمانوں کے جنگی کارناموں سے ملّتِ بیضا کے مستقبل کا پتہ:-

عہدِ نو برق ہی آتش زنِ ہر خرمن ہے
ایمن اس سے نہ کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے

اس نئی آگ کا اقوامِ کہن ایندھن ہے
ملّتِ ختمِ رسل شعلہ بہ پیراہن ہے

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا
(جوابِ شکوہ)

جنگِ بدر کا میدان گرم ہے (۱۶ مارچ ۶۲۴ء) مٹھی بھر مسلمانوں کے مقابلہ میں کفار کا ٹڈی دل

ہے خونِ فاسد کے لیے تعلیم مثلِ نیشتر

فوج نبرد آزما ہوتا ہے۔ مسلمانوں پر اضمحلال طاری ہے۔ اُس وقت سالارِ اعظمؐ بے چین ہو کر دستِ بدُعا ہوتے ہیں:۔

"خداوندا! آج اگر یہ جماعت شکست کھا گئی تو پھر دُنیا میں کوئی تیرا پوچھنے والا باقی نہ رہے گا۔" (حدیث)

اللہ اللہ! کیا معنی خیز دُعا تھی جس کی مثال خالق و مخلوق کے تعلقات میں معدوم ہے غیرتِ حق کو حرکت ہوتی ہے۔

یہ وہ وقت تھا جب تم اپنے پروردگار کے آگے فریاد کرتے تھے تو اُس نے تمھاری سُن لی اور فرمایا کہ "ہم لگاتار ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کریں گے (۸/۹) جب تمھارے پروردگار نے فرشتوں کو حکم دیا کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں تم مسلمانوں کے قدم جمائے رکھو۔ ہم کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے۔ اچھا تو لگے ان کافروں کی گردنوں پر اور لگے ان کی پور پور پر (۸/۱۲)

اس عظیم الشان جنگ نے ایمان و کفر میں ہمیشہ کے لیے فیصلہ کر دیا۔ خدا کا وعدۂ اعانت صرف اُسی جنگ تک محدود نہ تھا۔

غم و فکر نہ کرو تم (ہمیشہ) غالب رہو گے اگر تم ایمان والے ہوئے (۳/۱۳۸)

۶۲۴ سنہ سے ۶۴۴ سنہ تک جو ہماری بے پناہ فتوحات کا عالم تھا وہ اقبال ہی کی زبان سے سُنیے:۔

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے	پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے	تیغ کیا چیز ہے، ہم توپ سے لڑ جاتے تھے

فطرت ہے حوالوں کی زمیں گیر، زمیں تاز

نقشِ توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے
(شکوہ)

بنو اُمیّہ کے اقتدار کی تاریخ ۴۱ھ سے شروع ہوتی ہے۔ اُن کا سامنے آنا تھا کہ پہلے تو خانہ جنگیاں شروع ہوئیں۔ پھر فتوحات میں وہ یکسانیت نہ رہی۔ اوّل تو سلطنت کا غیر اسلامی بنیادی نصاب کیا کم تھا کہ تعیش و منافقت نے بھی جڑ پکڑ لی۔ مسلمانوں کو سب سے پہلی فاش شکست بمقام تور (فرانس) ۷۲۶ء میں نصیب ہوئی۔ ظاہر میں اس شکست کے مندرجہ ذیل اسباب پائے جاتے ہیں:۔

(۱) ہسپانیہ میں صوبہ داروں کا جلد جلد تبادلہ (۲) بربر قوم کا خروج۔
(۳) عربوں میں خانہ جنگی (۴) خارجیوں کا خروج و بغاوت (۵) حکومت کی بے انصافیاں و حرص جس کے باعث افریقہ کی نو مسلم قومیں بھی "جزیہ" سے مستثنیٰ نہیں قرار دی گئیں۔ (صفحات ۳۹۷ - ۳۹۹)

یہاں اسلامی تاریخ کا اعادہ منظور نہیں۔ سولھویں صدی تک مسلمانوں کو کفار کے ہاتھوں شاذ و نادر ہی ہزیمتیں اٹھانی پڑیں۔ لیکن جہاں بھی کلمہ گویان توحید کو شکست ہوئی اس کے اسباب میں اُن کے غیر اسلامی اعمال و فقدان خلوص و ایثار۔ مزید برآں وہ زہر آلود اثر جس سے اقبالؒ نے اپنے مشہور زمانہ شعر میں پناہ مانگی ہے۔

الحذر از صادقانِ ایں زمان
الحذر از جعفرانِ ایں زمان

اب فتوحات پر بھی ایک نظر ڈالنی ضروری ہے باوجود اس کے کہ

قیس زحمت کش تنہائی صحرا نہ رہے
شہر کے کھائے ہوئے بادیہ پیما نہ رہے
(جواب شکوہ)

مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنونِ خام

جب بھی کفر و اسلام کی آویزش ہوئی (اِلا ماشاء اللہ) بقول علامہ اقبالؒ
"وہ اسلام ہی تھا جس نے ملت کی جان بچائی۔" (تقریرات صفحہ ۴۳)

کفار کے مقابلہ میں مسلمانوں کی عظیم الشان فتوحات[1]

(فہرست (الف) بیرونِ ہند)

نمبر شمار	تاریخ و سنہ	مسلم فاتح	کافر مفتوح	میدانِ جنگ	کیفیت
۱	۷۱۱ء	طارق	راڈوک (ہسپانیہ)	عودالتیہ	یہ تاریخ عالم کے وہ مشہور کارنامہائے جنگی
۲	۸۰۶ء	ہارون رشید	نائس فورس (روما)	ہرقلیہ	ہیں جنھوں نے دنیا کی تاریخ بدل دی۔
۳	۸۳۶ء	معتصم	تھیوفیلس (")	عموریہ	ان تمام جنگوں کی تین خصوصیات تھیں۔
۴	۹۲۰ء	عبدالرحمٰن ثالث (ہسپانیہ)	تمام عیسائی یورپ	جنقرہ	(۱) مسلمانوں کی نسبتاً قلت تعداد و کفار کی
۵	۱۱۵۴ء	نورالدین محمود زنگی (حلبی)	"	روہع	کثرت بے انتہا (۲) یہ تقریباً تمام جنگیں
۶	۱۱۸۷ء	صلاح الدین ایوب	"	حطین	دشمنوں کے ملک میں لڑی گئیں (۳) بجز خلوص
۷	۱۲۸۹ء	ملک المنصور	"	طرابلس	نیت و نصرت الہٰی اور کوئی ظاہر سبب
۸	۱۲۶۰ء	الملک الظاہر	مغول	عین جالوت	مسلمانوں کی تعجب خیز فتوحات کا نہیں
۹	۱۴۴۴ء	مراد ثانی (ترکی)	تمام یورپ	درنہ	بتایا جا سکتا۔

[1] ہم ان کارناموں سے ان معرکوں کو خارج رکھتے ہیں جن کے معجزنما جزئیات محیر العقول ہیں اور جو بنی امیہ سے قبل واقع ہوئیں۔ مثلاً بدر (۶۲۴ء) یرموک (۶۳۶ء) قادسیہ (۶۳۷ء) اور اسکندریہ (۶۴۱ء)

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پابہ گل بھی ہے

(فہرست (ب) اندرونِ ہند)

نمبر شمار	تاریخ و سنہ	مسلم فاتح	کافر مفتوح	میدانِ جنگ	کیفیت
۱	۷۱۱ء	محمد بن قاسم	راجہ داہر (سندھی)	راور	یہ محمد بن قاسم کی متحدہ فتوحات میں سے صرف ایک ہے
۲	۱۰۰۸ء	محمود غزنوی	تمام ہنود و والیانِ ہند	اوہند	فتح سومناتھ (۱۰۲۴ء) کے وقت اس سے نالموہند و والیان ملک نے متحدہ مدافعت کرنے کی کوشش کی۔
۳	۱۱۹۲ء	محمد غوری	پرتھوی راج وغیرہ	تراوڑی ثانی	جنگ اولیٰ میں محمد غوری کو شکست ہوئی
۴	۱۳۰۶ء	علاؤالدین خلجی	متحدہ ہنود دکن	دیوگیر	جنور و ماروار کی فتح علاؤالدین کا کمتر کارنامہ نہیں ہے
۵	۱۵۲۷ء	بابر	رانا سانگا	فتح پور	تاریخ ہند میں یہ جنگ آپ اپنی مثال ہے جب
۶	۱۵۶۴ء	سلاطین دکن	مہاراجہ وجیانگر	تالی کوٹہ	ہندو مسلم سلاطین (جو ہمہ وقت خانہ جنگی میں مصروف
۷	۱۷۶۱ء	احمد شاہ ابدالی	متحدہ راجگان مرہٹہ	پانی پت	رہتے) مشترک دشمن کے مقابلہ میں متحد تھے۔ انگریز مورخین نے اس شکست کو بہت کچھ چھپانے
۸	۱۷۶۹ء	حیدر علی	انگریز	مدراس	کی کوشش کی ہے لیکن ملاحظہ ہو۔

ان اہم جنگی کارناموں کے اندرونی حالات پر اگر غور کیجیے تو مسلمانوں کی فتوحات کا صرف ایک راز معلوم ہوگا یعنی یہ کہ باایں ہمہ مغائرت دینی بوقت جنگ خدا کے نام پر اگر نبرد آزما تھے تو کم سے کم رب العزت سے اعانت کے طالب ضرور تھے۔ مثال کے طور پر بابر کا واقعہ لیجیے:۔

کنواہا[1] کا میدان جنگ ہے۔ رانا سانگا اور اس کے ہندو معاونین و مسلم منافقین کا ٹڈی دل فوج سامنے ہے۔ خود بابر کی مختصر فوج میں بے چینی و یاس کے آثار ہیں۔ فوجی افسروں کی متفقہ رائے ہے کہ پانی پت کی فتح تو آسان تھی لیکن کنواہا کا میدان کٹھن ہے۔ نجومیوں نے ہزیمت کی پیشگوئی کی۔ اعزہ و اقارب نے بھی واپسی کے مشورے دیئے لیکن بابر نے سب کو ٹھنڈے دل سے سُنا اور خلوت میں جا کر خدا سے دعا کی۔ کیا کہا اور کیا سُنا یہ خدا جانے

[1] یہ اصل نام مقام تھا جہاں بابر نے فتح حاصل کی۔ جس کے بعد بطور یادگار اس کا نام "فتحپور" رکھا گیا۔

کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدار قوتِ حیدری

لیکن جو تقریر اُس نے افسروں کے سامنے کی وہ اب تک تاریخ میں محفوظ ہے :-

"بہادر سردارانِ لشکر! تم خود بتاؤ کہ اگر ہم اس وقت پیٹھ دکھا گئے تو سلاطینِ عالمِ اسلامیہ میری بابت کیا رائے قائم کریں گے ؟ کہ یہ موت کے خوف سے خدا کی عطیہ سلطنت چھوڑ بھاگا۔ اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم خدا کے راستہ میں شہید ہو جائیں اور جب تک ایک فرد کے تن میں بھی جان ہے اڑے رہیں۔ کیونکہ مرنا تو یقینی ہے کیوں نہ عزت کی موت نصیب ہو۔ انسان کی زندگی کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ مرنے کے بعد اپنی نیکنامی چھوڑ جائے۔"

اس تقریر کے بعد اس نے اور اس کی تمامی فوج نے قرآن پر شراب خوری و دیگر معاصی سے توبہ کی۔ بابر نے داڑھی نہ منڈوانے کا عہد کیا۔ اس کے بعد جو ہوا سو ہوا۔ علامہ اقبالؒ اسی قسم کے مناظر کا نقشہ ان اشعار میں کھینچتے ہیں :-

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

آنے والی عظیم الشان جنگ اور مسلمانانِ عالم

آدم سے لے کر آج تک حق (اسلام) و ناحق (کفر) میں ہمیشہ جنگ رہی۔ کفر نے ہزار ہا کینچلیں بدلے لیکن اس کے معاندانہ رویہ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بعثت نبوی سے قبل صنم پرستی مقابل رہی۔ ظہور قدسی کے بعد عیسائیت حریف بن کر سامنے آئی۔ چونکہ نہ مذہب میں کوئی کشش تھی اور نہ معتقدین میں جوشِ خلوص، اس لیے یہ عیسائیت کا حریفانہ ڈھونگ بھی ختم ہونے لگا۔ اب اسلام کی مخالفت کا بیڑا اشتراکیت نے اٹھایا ہے۔ اوّل تو جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں یا آیندہ موقع سے بیان کروں گا۔ اشتراکیت کا مستقبل بہ حیثیت حریف اسلام خود کچھ روشن نہیں،

علاوہ بریں میں اُسے "ملحدانہ علیسائیت" سے تعبیر کرتا ہوں۔ اور بفحوائے پیشگوئی قرآنی (۵/۱۴) یہ گُتّے خود ہی تا قیامت آپس میں لڑتے رہیں گے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اپنی حفاظت سے غافل رہیں۔ بلکہ جیسا کہ علامہ اقبالؒ کی تقریرات و تحریرات کے بین السطور سے واضح ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے اسلام کی نشاۃ ثانیہ شروع ہوتی ہے اور علیسائی دنیا کی ہر خانہ جنگی میں دُنیائے اسلام کی منفعت شامل ہے۔ اس حالت میں دنیائے اسلام کو متحد ہو کر اس ہولناک نبرد آزمائی کا انتظار کرنا چاہیئے۔ یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے کہ دنیائے علیسائیت اب تک اپنی ذلت آمیز شکستوں کو بھولی نہیں ہے۔ آیندہ جنگ میں گو ہم فریق خاص نہ رہیں لیکن ہماری حیثیت صرف تماشائی کی کبھی نہیں رہ سکتی۔ روس و امریکہ کے مقابلہ میں ہماری مادی بے بضاعتی اظہر من الشمس ہے۔ اس لیے مسلمانانِ عالم کو یہ فیصلہ کر لینا پڑے گا کہ آیا وہ مسلمان ہو کر زندہ رہنا چاہتے ہیں یا نہیں، اگر جواب نفی میں ہے تو پھر ان سے ہمارا روئے خطاب نہیں، اگر جواب اقراری ہے تو بقول علامہ اقبالؒ وہ "اسلام ہی ہو گا جو مسلمانوں کو نجات دلائے گا۔"

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

ضمناً دو ایک محکِ امتحان کی توضیحیں اور باقی رہ گئی ہیں۔

کسی قوم کے روشن مستقبل کا اندازہ صرف اسی سے نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں قوت سے دوسری قوموں یا ملکوں کے فتح کی صلاحیت ہے یا نہیں۔ قرآن مجید اس ضمن میں تین صلاحیتوں کا ذکر فرماتا ہے (۱) فتح ملک (۲) قیام حکومت (۳) نظام سلطنت۔ اوّل الذکر آسان ترین ہے۔ کیا تاریخ اس کی شاہد نہیں کہ ہزاروں غنڈوں اور جتھے داروں نے لوٹ مار کر کے کسی ملک پر قبضہ و اقتدار جما لیا۔ لیکن ان میں چونکہ قیام حکومت کی صلاحیت نہ تھی اس لیے بہت جلد فنا ہو گئے۔ علامہ اقبالؒ اسے "جہانبانی"[1] سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن جہانبانی مادی قویٰ پر اقتدار سے حاصل ہوتی ہے۔ اس سے بھی ارفع و اعلیٰ ایک صلاحیت ہے جس سے سلطنت میں وہ نظم و نسق پیدا ہوتا ہے جس سے مملکت "جنت" بن جاتی ہے اور یہی پائداری کی ضامن ہے۔ مسلمانوں میں بحمداللہ تینوں

---

[1] جہانبانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی — جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

روایات و صلاحیتیں موجود ہیں۔

ہمارے فاتحانہ انداز تو یہ تھے کہ:۔

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا در خیبر کس نے؟ شہر قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے؟
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے؟ کاٹ کر رکھ دیے کفار کے لشکر کس نے؟
کس نے ٹھنڈا کیا آتش کدۂ ایراں کو
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو (شکوہ)

ہماری جہانبانی کی مختصر روداد بھی علامہ اقبالؒ ہی سے سنیئے۔

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے نوع انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبہ کو جبینوں سے بسایا ہم نے تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے

اگر دنیا میں کوئی جماعت ہے جس میں دوزخ کو آناً فاناً جنت میں تبدیل کرنے کے لیے نہایت قوی نظام سلطنت ہے تو وہ اسلام ہے۔ یہ اپنی خودستائی نہیں، دشمنوں کا اعتراف ملاحظہ ہو:۔

ہمیں تسلیم ہے کہ عیسائیوں کا معیار اخلاق بلند تر ہے۔ لیکن وہ افراد کی وسعت سے تقریباً بالاتر ہے اور یقیناً حکومت کے لیے ناقابل حصول مسلمانوں کی معیاری اسلامی حکومت نہ صرف ذہن میں آسکتی ہے بلکہ واقعتاً محمدؐ اور ان کے خلفاء نے اسے حاصل کر کے دکھا دیا۔ (ڈاکٹر براؤن۔ تاریخ ادبیات جلد اول صفحہ ۸۸)

اب ایک آخری سوال یہ ہے کہ گو ہمیں اس دنیا میں شکستیں بھی اٹھانی پڑیں لیکن کیا ان شکستوں اور ہزیمتوں نے ہماری خودی کو ہمیشہ کے لیے فنا کر دیا، اور کیا قوم میں احیاء خودی کی صلاحیت مفقود ہو گئی ہے۔ قبل اس کے کہ میں علامہ کا اس بارے میں فتویٰ پیش کروں، ان کے خطبۂ صدارت (آل انڈیا مسلم لیگ ۱۹۳۰ء) کا نہایت دلچسپ اقتباس پیش کرتا ہوں۔ واضح ہو کہ کوئی ایماندار طبیب کسی مریض کو دوا و پرہیز کی ہدایت نہیں کرے گا جب تک اسے اس مریض میں صحت کے آثار نہ دکھائی دیں۔

چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب

مادہ سے روح کی طرف بڑھ چلو۔ مادہ میں تنوع و اختلافات ہیں۔ روح روشنی ہے زندگی ہے اور اتحاد ہے۔ اسلامی تاریخ سے میں نے ایک سبق سیکھا ہے۔ ان کی تاریخ کے نازک موقعوں پر اسلام ہی نے ان کی نجات دلائی ہے۔ مسلمانوں نے اسلام کو نہیں بچایا۔ اگر آج تم اسلام کو اپنا مرکز خیال بنا لو اور اس کے ہر آن زندگی افزا تخیلات کے ملہم بن جاؤ تو تم اپنے شیرازۂ پریشان کو مجتمع کر کے اپنی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ حاصل کر لو گے اور اس طرح خود کو کلیتاً فنا ہونے سے بچا لو گے۔ قرآن کی غامض ترین آیتوں میں سے وہ آیۃ ہے جو نوع انسان کی حیات و موت کو ایک فردِ واحد کی پیدائش و موت کے مماثل قرار دیتی ہے۔ اس تخیل انسانی کے اعلیٰ مفسر کی حیثیت سے کیوں نہ تم اس طرح زندگی بسر کرو اور نقل و حرکت کرو گویا تم سب ایک فردِ واحد ہو۔ میں اپنے اس قول سے کسی کو ابہام میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا کہ "ہندوستان کے موجودہ حالات وہ نہیں ہیں جو بظاہر معلوم ہوتے ہیں" اس کا صحیح مفہوم اس وقت تمھیں معلوم ہوگا جب تم ایک اجتماعی خودی حاصل کر کے اس پر نظر ڈالو گے۔ یہ الفاظ قرآنی

استقلال سے جمع رہو کوئی خطا کار تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اگر

تم ہدایت یافتہ ہو (۱۵/۱۰۵) (تقریرات صفحہ ۳۵-۳۶)

یہ تو ناصحانہ انداز تھا۔ لیکن بہ حیثیت "شاعرِ فردا" وملہم اقبال اپنی قوم پر اس کا اثر بھی پاتے ہیں اور اس لیے اس کا مستقبل بھی انھیں نظر آتا ہے:۔

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا

کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

باب ہفتم

متفرقات

اس مقالہ میں علامہ اقبالؒ کی متفرق پیش گوئیوں سے بحث کی گئی ہے
لیکن نقطۂ اسلامیہ ہر حالت میں مدِنظر رکھا گیا ہے۔ اس میں تہذیب
مغربی و چین کی بابت جو پیش گوئیاں ہیں وہ خاص توجہ کی محتاج ہیں۔
بحمداللہ پاکستان کی پیش گوئی پوری ہو چکی

متفرقات

۱۔ تہذیب مغربی کے بنیادی اجزاء :۔ یہودیت و عیسائیت کا
اتحاد اسلام کے خلاف ۔ یہودیوں کی سرمایہ داری کا اثر۔

۲۔ مغربی تہذیب ناشدنی ہے :۔ رینلڈ کا خیال ۔ اقبال کے
تجربات و پیش گوئیاں ۔

۳۔ یہ یہود فتنہ گر، یہ روح مزدک کا بروز۔

۴۔ اشتراکیت اور اس کے اجزاء :۔ اقبال کی پیش گوئیاں ۔
مزدور جماعت ۔

۵۔ اقوام مشرق :۔ (الف) بھارت ۔ پاکستان (ب) کشمیر
(ج) پنجاب (د) افغانستان (ہ) سرحدی اقوام (و) ایران
(ذ) فتنہ مغول چین (خ) سلطنت ترکیہ

۶۔ اختتام

باب ہفتم

متفرقات

نظر آئے گا اُسی کو یہ جہانِ دوشِ فردا
جسے آگئی میسّر مری شوخیٔ نظارہ
(اقبالؒ)

۱۔ تہذیبِ مغربی کے بنیادی اجزاء:۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا
(بانگ درا)

ہر قوم و ملت کے دو اصول اخلاق و عمل ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جن پر موسّس ملت نے اس قوم کی بنیاد قائم کی تھی اور دوسرا وہ جو امتداد زمانہ سے بدلتے بدلاتے اس کی فطرۃ ثانیہ بن جاتی ہے۔ دنیا کے مشہور مذاہب میں آپ کو کوئی بھی ایسا مذہب نہ ملے گا جس کی بنیاد نفرت و عداوت پر قائم کی گئی ہو۔ اس لیے کہ بقول گرنگیری دہائٹ:۔

> مذہب انسان کی ضروریاتِ زندگی کے لیے مخترع ہوتا ہے۔ انسان مذہب کے لیے نہیں بنایا جاتا۔

سولھویں صدی قبل مسیح میں مصر کی سیاسی و اخلاقی ضروریات کے باعث موسیٰؑ کی بعثت ضروری سمجھی گئی۔ خدا کے کرم اور حضرت موسیٰؑ کی کوششوں سے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے تو نجات مل گئی۔ لیکن اس خبیث قوم نے "ملک موعودہ" میں پہنچ کر فسادات اٹھائے۔ جس سے آج تک دنیا

پناہ مانگ رہی ہے۔ قرآن مجید میں ان کی بداعمالیاں بالتفصیل درج ہیں :-

گوسالہ پرستی (۲/۵۱) بدکاری (۲/۹۱/۹۲) ناشکری و کمینہ پن (۲/۶۱)

انبیاء علیہم السلام کے قتل (۲/۶۱) خدا سے بدعہدی (۴/۱۰۰)

قتل و خونریزی (۲/۸۵) سودخوری و غبن (۴/۱۶۱) وغیرہ وغیرہ

ان بدکاریوں کے باعث خدا نے جو عذاب بھیجے ان کے ذکر سے دل کانپ اٹھتا ہے:-

طاعون (۲/۵۹) مسخ بشکل قردہ و خنازیر (۵/۶۰) وغیرہ وغیرہ

حضرت داؤدؑ و عیسیٰؑ کی لعنت و پیش گوئیوں کا ذکر قرآن میں بطور اجمال درج ہے (۵/۷۸) لیکن تورات میں حضرت موسیٰؑ کی پیش گوئیاں بالکل واضح ہیں :- نقصان مال و جان کی پیش گوئیوں کے بعد ان کی معاشرت و اخلاق کی بابت جو پیش گوئی ہے وہ دلچسپی سے خالی نہیں ۔

تم روز بروز ظلم و نکبت کے شکار ہو گے ۔ تم مکان بناؤ گے جس میں دوسرے سکونت رکھیں گے ۔ تمھارے لڑکے و لڑکیاں دوسروں کو دی جائیں گی ۔ تمھاری زمین و محنت کے پھل ایک ایسی قوم کھائے گی جسے تم نہیں جانتے اور تم ہمیشہ پس پا و ذلیل رہو گے (ڈیوٹ ۲۸ ۔ ۲۰/۲۸)

حضرت عیسیٰؑ کی بددعا (۵/۷۵) کے بعد یہ بدنصیب قوم صدیوں مبتلائے عذاب رہی ۔ خاتم الانبیاءؐ کی بعثت کے بعد خدائے رحیم نے اسے دوبارہ موقع عنایت فرمایا (۱۷/۱۸) لیکن یہ کب سنبھلنے والی تھی بالآخر حضرت کی زبان سے خدا نے ان کی بابت پیش گوئی فرمائی :-

خدا نے فرمایا کہ اے عیسیٰ ! میں تمھیں موت دوں گا یا اپنی طرف اُٹھا لوں گا ۔ اور تمھیں پاک و صاف کروں گا تمھارے منکرین کے اتہامات سے ، اور تمھارے متبعین کو قیامت تک تمھارے منکرین پہ سیادت دوں گا (۳/۵۴)

جب یہودیوں کے فتنہ وفساد سے دُنیا کانپ اٹھی تو حضرت عیسیٰؑ مبعوث ہوئے۔ عیسائیوں نے اپنی سیاسی سیادت کے شش سالہ دَور میں یہودیوں پر اس سے زیادہ مظالم کیے۔ حضرت موسیٰؑ نے پیش گوئی فرمائی تھی، اب دنیا کو آخری نبی کی ضرورت تھی جو مذہبی وقومی جھگڑوں کو ختم کرکے دنیا میں انصاف و عدل کی حکومت قائم کرے۔ لیکن جب وہ تشریف لائے تو یہودیوں نے تو اپنی جبلّی عادت کے مطابق ان کی تکذیب کی۔ لیکن عیسائیوں نے از راہِ حسد وضد انکار کیا، جس کی سزا میں عیسائیوں پر باہمی جنگ ونفاق کا عذاب مسلّط کیا گیا۔

اور وہ لوگ جو خود کو عیسائی کہلاتے ہیں ان سے ہم نے عہد لیا تھا۔
لیکن انھوں نے اس کے ایک وعدہ سے روگردانی کی، اس لیے
(سزاءً) ہم نے ان کے درمیان باہمی عداوت ونفرت ڈال دی جو قیامت
تک رہے گی۔ (۵/۱۴)

جب مسلمانوں کو سیاسی عروج نصیب ہوا تو چندے یہودی وعیسائی دونوں سرنگوں رہے۔ لیکن یہودی اپنی شرارت سے کب باز آتے، انھوں نے اسلام میں رخنہ اندازیاں شروع کیں۔ چنانچہ سب سے پہلا اسلام میں مذہبی اختلاف وفقہ ایک یہودی عبداللہ بن سبا (۶۵۳ء) کا قائم کیا ہوا ہے جس نے مصر میں حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کا اعلان کیا۔ بعد چندے جب مسلمانوں کو سیاسی انحطاط شروع ہوا تو عیسائی و یہودی دونوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کیا جس کی بنیاد انگلستان کے یہودی وزیر اعظم ڈزرائیلی نے رکھی: "یہودی کی دولت اور عیسائی کی محنت" یہ اصول قرار پایا۔ دنیائے اسلام کے علاوہ یہودیوں نے یورپ وامریکہ میں بھی پاؤں پھیلائے۔

کرک پیٹرک نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف "سرمایہ داری کی موت" میں اس اتحاد پر عجیب وغریب روشنی ڈالی ہے۔ جس کے اقتباسات قارئین کی دلچسپی کے لیے درج ذیل ہیں:۔

بے وقوف عیسائی یہودی سے اتحاد کرتے وقت یہ دیکھا کر مزدور، مزدور

ہی ہے اور سرمایہ دار، سرمایہ دار ہی۔ اس میں شبہ نہیں کہ چند دنوں تک
تو علیسائیت (مزدور) خوب چمکی اور سارے مشرق پر چھا گئی، لیکن سرمایہ دار
یہودیت نے تمدن و تہذیب کے ساتھ ساتھ علیسائیت کا بھی دیوالہ نکال
دیا۔ علیسائیوں کی آنکھ اس وقت کھلی جب عیسٰی کا مذہب دنیا سے نیست و
نابود ہو گیا اور لکشمی کے پجاری اپنا تسلط جما چکے تھے۔ اگر ۱۹۱۴ء کی جنگ
نہ ہوتی تو شاید خود کو علیسائی کہنے والا بھی کوئی نہ ملتا۔

یہودی سرمایہ داری کی بابت یہی مبصر لکھتا ہے:۔

لیکن سرمایہ داری اتنی بڑی معصیت ہے جو خود اپنے فنا کرنے کے اسباب
اپنے ساتھ پیدا کرتی رہتی ہے۔ مشرقی اقوام کو جس طرح غلام بنایا گیا جس
طرح اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے ان کی تہذیب و تمدن کو بھینٹ
چڑھایا گیا اور جس طرح ان کے گلے ایسے گھونٹے گئے کہ وہ آہ بھی نہ کر سکیں
یہ وہ جرائم تھے جن کو قوانین فطرت کبھی معاف نہیں کر سکتے۔ آج اشتراکیت
اسی ظلم کا انتقام لینے کے لیے اٹھی ہے۔"

اب اس مختصر سی تمہید کو پس منظر قرار دے کر علامہ اقبالؒ کے زریں خیالات ملاحظہ ہوں:۔

۲۔ مغربی تہذیب ناشدنی ہے:۔

میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

اگر ہم علامہ اقبالؒ کی سوانح حیات کو بغور دیکھیں تو ہمیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے خدا
نے آپ کو ایک مفکرانہ ذہن اور مبصرانہ و دقیقہ نظر عطا فرمائی تھی۔ والد کا تقدس وراثتاً پایا۔ مدرسہ و کالج میں
داخل ہوئے تو وہاں بھی محققین ہی کی صحبت سے لطف اندوز رہے۔ یورپ گئے تو عام ہندوستانی طلبہ کی

نغمۂ بیداریٔ جمہور ہے سامانِ عیش

طرح وہاں کے چار تحالف "خمر و خنزیر و روزنامہ و زن" سے مرعوب نہ ہوئے برخلاف اس کے اُن پر اُن کا بالکل برعکس اثر پڑا۔ اول تو ع "از علوم ظاہری پیراستہ" تھے۔ پھر ذہن رسا تھا۔ فلسفہ و تاریخ کے مطالعہ نے ان کی آنکھیں کھول تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تہذیبِ مغربی سے مرعوب ہونے کے بجائے اس سے متنفر ہو گئے۔ اس نفرت کا سبب وہ محققانہ نظر تھی جس سے آپ "منکرین محمدؐ" کی بے بضاعتی دیکھ رہے تھے۔

افسوس ہے کہ خود مسلمانوں ہی نے کمتر "ختمِ نبوت" کی اہمیت سمجھی، اس لیے اگر "روحانیت کا دیوالیہ" یورپ اس کے کنہ سے آج تک ناواقف رہا تو کیا تعجب؟ اقبال؎ اپنے لکچرس (صفحہ ۱۲۷) میں نظریۂ ختمِ نبوت پر نہایت دقیق بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

> "اس نظریہ کی مفکرانہ اہمیت یہ ہے کہ وہ روحانی تجربات کی طرف ایک آزاد محققانہ رجحان کی تخلیق کر کے اس عقیدہ کو ذہن نشین کرتا ہے کہ بعد ازاں ہر وہ شخصی سیادت جو مافوق الفطرت وسائل سے اپنے اختیارات کی سند حاصل کرتی ہے وہ اب ختم ہو گئی۔

یورپ روحانی تجربات ہی کا قائل تھا کہ اسے اس کی محققانہ تفتیش کی فکر ہوتی۔ یہ مادہ پرست اور لکشمی کے پجاری یہودانہ سرمایہ داری کی ذہنیت رکھنے والے، مشرق کو غلام بنا کر درندوں کی طرح اُن کا خون چوسنے والے اس حامل نظریہ کی کب پروا کر سکتے ہیں۔ جو قوم و نسل و نسب کی فوقیت کو مٹا کر "انجمن قوم" کے بجائے "انجمن آدم" بنانے آیا ہو۔ مغربی تہذیب کی یہی وہ اساسی غلطی ہے جو اسے جہنم کی طرف دھکیلے لیے جا رہی ہے۔

رینلڈ مغرب کی بداخلاقی کا رونا روتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

> "مغربی تہذیب ناشدنی ہے۔ آج سے صدیوں پہلے بزمانہ شہنشاہ جسٹینین عیسائی حکمرانوں کا جو حال تھا کہ وہ ایک دوسرے کو کھائے ڈالتے تھے۔

بعینہٖ آج اُسی کو تاریخ دُہرا رہی ہے۔ عقل اس کے صحیح اسباب کی
تلاش میں سرگرداں ہے، کوئی "جمعیت اقوام" بناتا ہے کوئی یُو این او
کی بنیاد رکھتا ہے۔ لیکن یہ سب اشک شوئی سے زیادہ وقیع نہیں۔
مرض کچھ اور ہے اور دوا کچھ اَور۔ آج ہمیں اس نظام حیات کی ضرورت
ہے جو دُنیا کو ہمہ گیر اخوّت کا سبق دے۔ "جمعیت آدم" کی ضرورت
ہے نہ کہ "جمعیت اقوام" کی۔

رینلڈ کا ذہن نارسا اس سے آگے نہ پہنچ سکا۔ لیکن انگلستان کے مشہور مصنّف اور مفکر برناڈشا
کا خیال ہے کہ

"آج محمدؐ ہی کا مذہب ہے جو دنیا میں امن وامان قائم کرسکتا ہے۔"

یہی وہ اصلیت تھی جسے اقبال سمجھ گئے اور وہ چیخ اٹھے :۔

میرے آقا وہ جہاں زیر وزبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پہ مدار

اقبالؒ نے یورپ کی کھوکھلی تہذیب کا مطالعہ کرتے ہوئے برسوں پہلے پیش گوئی کردی تھی کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

کیا یورپ کی گزشتہ دو جنگوں کی تاریخ اور آیندہ جنگ جو سر پہ منڈلا رہی ہے اس حقیقت کی
تائید نہیں کرتی ؟ اقبالؒ کا عقیدہ ہے کہ مغربی تمدن کی بناء سرمایہ داری ہے[1] جو امن وسکون کے
منافی ہے۔ اس لیے جب تک اس بیہودا نہ ذہنیت کا استیصال کامل نہ ہوگا حقیقی دانش وپُرامن تمدن
کی تحصیل ناممکن ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو:۔ تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا — جہاں میں جس تمدّن کی بناء سرمایہ داری ہے

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو

تا تہ و بالا نگردد ایں نظام　　　دانش و تہذیبِ دیں سودائے خام

میں پچھلے صفحات میں عرض کر چکا ہوں کہ ابتداً تو یہودیت و عیسائیت کی بنیادیں ضروریاتِ زمانہ کے موافق رکھی گئیں۔ لیکن ان دونوں قوموں نے بہت جلد اپنی ہیئت بدل دی جو اب ان کی فطرتِ ثانیہ ہوگئی ہے اور یہ نقائص اس وقت تک دور نہیں ہو سکتے جب تک اس عمارت کا کلیتاً انہدام نہ ہو جائے۔

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند　　　می ندانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

گزشتہ دونوں جنگیں کیا اپنے ساتھ کافی سبق آموز حقیقت نہیں لائیں؟ لیکن خدا کی پیش گوئی پوری ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی، جب کہ یہ درندے آپس میں لڑ کر تباہ نہ ہو جائیں، ہزارہا "جمعیت اقوام" قائم ہوں گی لیکن ان کی قسمت کا لکھا پورا ہو کر رہے گا۔

جب جنگِ عالم اولیٰ کے بعد جمعیت اقوام قائم ہوئی تو دنیا نے سمجھا کہ شاید یہ درندے کچھ دنوں تو آدم دری سے باز رہیں گے؛ لیکن اقبالؒ کی دور بین نگاہوں نے جس طرح اس کا خیر مقدم کیا۔ وہ آج اپنی مقبولیت کے باعث ادبی دنیا میں زبان زد عوام ہے:۔

ــــــ کفن دزدے چند ــــــ بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

اس کی بابت پیش گوئی بھی ملاحظہ ہو:۔

ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ　　　ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

وہی ہوا جو ہونے والا تھا۔ آج یو۔ این۔ او۔ اسی کی خاکستر سے نو زائیدہ ققنس ہے۔ اس لیے اس کا حشر بھی معلوم۔

۳۔ یہ یہود فتنہ گر، یہ روحِ مزدک کا بروز:۔

شیوۂ تہذیبِ نو آدم دری ست　　　پردۂ آدم دری سوداگری ست

ایں بنوکِ فکرِ چالاکِ یہود　　　نورِ حق از سینۂ آدم ربود　　　(پس چہ باید کرد)

آج یہ حقیقت روشن ہے کہ دنیا کی بے چینی کی ساری ذمہ داری سرمایہ داروں کی خود غرضی پر مبنی ہے۔

جو کرے گا امتیازِ رنگ و بو مٹ جائے گا

اور یہ بھی اظہر من الشمس ہے کہ اس "خوں آشام" طبقہ کی سیادت کا تاج یہودیوں کے سر ہے۔ جنگِ عظیم اولیٰ اسی بدبخت گروہ کی سازشوں کا نتیجہ تھی جس کے مذموم نتائج نے دنیا کو دوسری جنگ پر آمادہ کر دیا، یہ بھی ختم ہوئی لیکن یہ فتنہ ساماں پھر بھی فنا نہ ہو سکا۔ آج فلسطین ہی نہیں بلکہ جہاں کہیں فتنہ ہے وہ اسی "روح مزدک بروز" کے دم قدم سے ہے۔ کسے خبر کہ موجودہ کشاکش تیسری جنگ کا پیش خیمہ ہو۔ اس لیے یہ سوال اہم ہے کہ فطرت کب تک اس فتنۂ عظیم کو دنیا کے امن میں خلل انداز رہنے دے گی۔

یہودیوں کے مستقبل کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے اس قضیہ کو صغریٰ و کبریٰ میں تقسیم کیجیے۔

(۱) موجودہ مغربی تہذیب و تمدن بہت جلد تباہ ہونے والا ہے۔ فرماتے ہیں:[1]

(الف) دیکھ لوگے سطوتِ رفتارِ دریا کا علاج — موجِ مضطر ہی اُسے زنجیر پا ہو جائے گی

(ب) دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے — کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہو گا

(۲) موجودہ تہذیب و تمدن کی تمام تر بنیاد سرمایہ دارانہ ذہنیت پر ہے جو خود غیر فطری ہونے کے سبب ناشدنی ہے۔

تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا — جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

(ج) آج یہودی ہی ساری دنیا میں سرمایہ دار کی روح رواں ہیں۔ اس لیے لازماً یہ بھی فنا ہوں گے۔

وہ یہودی فتنہ گر، وہ روحِ مزدک کا بروز
ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں کا تار تار

مگر یہ دنیا عالم اسباب ہے۔ اس لیے اس عظیم و عالمگیر فتنہ کو ختم کرنے اور اس کا سر کچلنے کے لیے فطرت نے اشتراکیت کو سامنے لا کھڑا کیا۔

---

[1] اسی مضمون کو بہتر طریقہ سے دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے:
تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج — موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی

۴ ۔ اشتراکیت :۔

اشتراکیت کے دو حصے ہیں ۔ ایک تو اس کا جزو اصلی ہے ۔

حکومت قوم کی نائب ہے ۔ اس لیے قوم کی ہر شے حکومت کی ملکیت ہے ۔ چونکہ افراد عموماً احسان و انصاف کرنے سے معذور ہیں ۔ اس لیے حکومت ہر ذرائع آمدنی کو اپنے ہاتھ میں رکھ کر تمام قوم ان کی ضرورت کے مطابق اس کی آمدنی و منافع کو تقسیم کرتی ہے ۔

لیکن چونکہ سرمایہ داروں نے اپنے ہاتھوں کو مضبوط کرنے کے لیے مذہب کا ڈھونگ رچا رکھا تھا ۔ اس لیے "نیفض المعاویہ" میں اشتراکیوں نے مذہب کے خلاف بھی جنگ کا اعلان کر دیا ۔ اقبالؒ کا خیال ہے کہ اشتراکیت کی یہ ثانوی غرض صرف دنیا سے غلط مذہبی تخیل کو ختم کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے ۔

روش قضائے الٰہی ہے کچھ عجیب و غریب   خبر نہیں کہ ضمیر جہاں میں ہے کیا بات
ہوئے ہیں کسر چلیپا کے واسطے مامور   وہی فقط کہ چلیپا کو جانتے تھے نجات

یہ وحی حریت روس پر ہوئی نازل
کہ توڑ ڈالے کلیسائیوں کے لات و منات

اقبالؒ کا عقیدہ ہے کہ اشتراکیت کی یہ مساویانہ تقسیم منفعت کا اصول صرف اس تخیل کا ... ہے جو امراء و صاحب دولت میں پیوست ہو گیا ہے ۔ قرآن صاف حکم دیتا ہے کہ

وہ پوچھتے ہیں کہ (خدا کے راستے میں) کیا خرچ کریں ۔ کہہ دو کہ جو کچھ تم کر سکو (قل العفو سورہ بقرہ آیۃ ۲۱۹)

اسی آیۃ کریمہ کی طرف اشارہ فرماتے ہیں :۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم   بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے

اندیشہ ہوا شوخیٔ رفتار پہ مجھ کو | فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنھیں رکھا تھا چھپا کر | کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

واقعاتِ حاضرہ کی رفتار صاف بتا رہی ہے کہ علامہ کی یہ پیش گوئی پوری ہو کر رہے گی۔ علامہ کو مزدوروں کے طبقہ سے جو ہمدردی ہے وہ قرآنی اسناد کی بنا پر ہے۔ اسی لیے وہ جزو اوّل کے موافق ہیں۔ ملاحظہ ہو آیتہ کریمہ قرآنیہ (۱۶/۷۱)

خدا نے رزق میں تمھیں ایک دوسرے پر فوقیت دی ہے تاکہ تم اپنے
زیردستوں کے سامنے اپنی دولت مساویانہ تقسیم کرو۔

اور چونکہ علامہ احیاءِ اصولِ اسلامیہ کے معتقد ہیں اس لیے انھیں یقین ہے کہ مزدور جماعت کا مستقبل نہایت شاندار ہے۔ "خضرِ راہ" میں ایک نہایت پُرمعنی و جوش دلانے والا بند ہے جو بعینہٖ درج ذیل ہے۔ جس میں اس جماعت کے مستقبل کی بابت پیش گوئی بھی شامل ہے :۔

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے | خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر | شاخِ آہو پہ رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی | اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ
ساحرِ الموط[1] نے تجھ کو دیا برگِ حشیش | اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ | خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے | سُکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات

---

[1] مراد حسن بن صباح جس نے بحرِ خزر کے جنوبی ساحل پر بمقام الموط باطنیہ فرقہ کا مضبوط قلعہ بنا رکھا تھا۔

جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیرِ سیمابی

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار — انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے

اقبالؒ نے اپنی مشہور زمانہ فارسی نظم میں (جو مع ترجمہ درج ذیل ہے) یہ پیش گوئی فرمائی ہے کہ روس کی یہ دہریت ایک دن ختم ہو کر رہے گی اور اس وقت تعجب نہیں کہ وہ اسلام سے قریب تر ہو جائے۔

فارسی نظم	ترجمہ اُردو
نکتہ می گویم از مردانِ حال	میں اصحاب دل کی روایت سے ایک نکتہ بیان کرتا ہوں۔
اُمتاں را لا جلال اِلّا جمال	اُمت محمدیہ کے لیے جلال کی نفی اور جمال کا اثبات
ہمچناں بینی کہ در دَورِ فرنگ	اسی طرح تم اس فرنگی (مغربی) دَور میں دیکھو گے
بندگی با خواجگی آمد بہ جنگ	کہ غلام آقا سے جنگ پر آمادہ ہے۔
روس را قلب و جگر گردیدہ خوں	روس کے قلب و جگر بوجہ غم و غصہ خون ہو گئے
از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں	یہاں تک کہ اس کے ضمیر سے شے کا "انکار" نکل آیا
آں نظامِ کہنہ را بیروں زد است	اُس پُرانے نظام کو اس نے تہس نہس کر دیا
تیز نیشے بر رگِ عالم زد است	اور بہت تیز چوٹ عالم کے رگ پر لگائی۔
کردہ ام اندر مقاماتش نگہ	میں نے اس کے مقامات و منازل پر غور کیا ہے
لا سلاطیں، لا کلیسا، لا الٰہ	وہ سلطنت و کلیسا و خدا سب کا منکر ہے
فکرِ او در تند بادِ لا بماند	اس کی تیز فکر نفی تک محدود رہی۔
مرکبِ خود را سوئے اِلّا نراند	اور اس نے اپنے گھوڑے کو اثبات کی طرف نہیں دوڑایا
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں	وہ دن آنے والا ہے کہ اپنے جوشِ جنوں سے
خویش را از تند باد آرد بروں	وہ اپنی تیز فکر کو چھوڑ کر باہر آجائے گا۔

کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے

در مقامِ لا بنا ساید حیات	زندگی "نفی" میں راحت نہیں پا سکتی
سُوئے اِلّا می خرامد کائنات	یہ کائنات لازماً اثبات کی طرف جائے گی

(پس چہ باید کرد)

اقبالؒ کی دوربین نگاہیں وہ زمانہ دیکھ رہی ہیں جب سرمایہ داری کو فنا کرنے کے بعد اشتراکیت بے موت مرجائے گی۔ اس لیے کہ معیارِ حیات اپنی منفی صورت میں کسی قوم کو منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتا۔[1] شیطان کو مزدکیت سے مطلق خوف نہیں۔ اگر خوف ہے تو وہ اسلام سے ہے۔

ع مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

۵۔ اقوامِ شرق:۔

ایشیا کی قومیں یقیناً ایک نہ ایک دن مغرب کے استفادی جبری نظام کے خلاف اٹھ کھڑی ہوں گی جو اُس نے (مغرب نے) ترقی دے رکھا ہے اور مشرق پر جبراً مسلط کر دیا ہے۔ ایشیا کبھی موجودہ مغربی سرمایہ داری اور اس کے غیر مرتب انفرادی نظام کو قبول نہیں کر سکتا۔

(تقریرات و تحریرات صفحہ ۵۴)

یوں تو علامہ اقبالؒ "پس چہ باید کرد، اے اقوامِ شرق" میں نے اقوامِ شرق کی ہدایت کے لیے متعدد مفید نصیحتیں کی ہیں، جن کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ لیکن ان میں پیش گوئیاں تقریباً مفقود ہیں۔ اس لیے ہم ان کی دوسری تصانیف سے اس بارہ میں استفادہ کریں گے۔

اس مختصر رسالہ میں اسبابِ زوالِ مشرق سے بحث بے جا نہ ہوگی۔ بیداریٔ مشرق کے اسباب

---

[1] کیا مسلمان کسی دل جلے کے اس شعر پر غور کریں گے؟

افسوس ہے اس قوم پہ اے حضرتِ واعظ	جو لا میں نہ الا میں نہ "ہی" میں ہے نہ "شی" میں

بھی متعدد پیچیدہ ہیں، لیکن ہماری اغراض کے لیے اس قدر جاننا ضروری ہے کہ

فطرت کے تقاضوں سے ہوا حشر پہ مجبور
وہ مردہ کہ تھا بانگ سرافیل کا محتاج

یورپ کے مظالم (لوٹ کھسوٹ و قتل و غارت نے ہماری رگ عصبیت میں حرارت پیدا کر دی۔ ع "عروقِ مردہ مشرق میں خونِ زندگی د..." یہ سیلان اس "فردائے قیامت" کا پتہ دیتا ہے۔ جب نہ صرف مشرق کلیتاً مغربی سیادت سے آزاد ہو جائے گا (انشاء اللہ) بلکہ عجب نہیں جب ہمارے پرچم پھر اسپین و دنیا پر لہرانے لگیں۔ آج زیادہ سے زیادہ بیس برس ہوئے ہوں گے جب اقبالؒ نے مشرقی بیداری کی پیش گوئی فرمائی تھی۔ کسے خبر تھی کہ اس صاحب نظر کا خواب جنگِ عظیم ثانی کے بعد فوراً ہی اس طرح شرمندۂ تعبیر ہو جائے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ آج ایشیا کا کم تر حصّہ ہے جہاں سے مغربی سیادت کا جنازہ نہ نکل چکا ہو۔ چین و فلپائن سے سویز تک اور سمر قند سے انڈونیشیا تک سب نے مغربی جُوا اپنی گردن سے پھینک دیا۔

اقبالؒ جب "مشرق" کا لفظ فرماتے ہیں اس سے صرف "ایشیا" مراد لینا غلطی ہے۔ اس میں افریقہ کی وہ مسلم و غیر مسلم قومیں بھی شامل ہیں جو یورپ کے ظلم انگیزیوں کا شکار رہیں۔ آج شمالی افریقہ کی مسلم قومیں بھی بیدار ہو چکی ہیں۔ مصر آزاد ہو گیا۔ طرابلس میں آزاد سلطنت قائم ہو چکی۔ ٹیونس و الجزائر و مراکش میں مکمل آزادی کی تحریکیں اپنے شباب پر ہیں۔ وہ زمانہ دور نہیں جب وسطی و مشرقی و مغربی افریقہ کی قومیں بھی اپنی آزادی کا اعلان کر دیں۔

اب ایشیا کے مختلف خطوں میں بسنے والی قوموں کی بابت اقبال کی پیش گوئیاں ملاحظہ ہوں:۔

(الف) ہندوستان

دگرگوں کشورِ ہندوستان است
دگرگوں ایں زمین و آسمان است

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

تقریباً نصف صدی قبل علامہ نے یورپ سے واپسی پر جو تنبیہہ دی تھی وہ لائقِ اعتناد ہے

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو — کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے — عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے — تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

اس نصیحت کا اصل مقصد ہندو مسلم اتحاد تھا۔ جس کا شیشہ ایک طرف تو انگریزوں کی شاہنشاہنہ پالیسی اور دوسری طرف ہندوؤں کی خود غرضی کی بنا پر چور چور ہو رہا تھا۔ لیکن جب علامہ نے دیکھا کہ ان کی نصیحت ہندوؤں کے لیے صدا بصحرا ثابت ہو رہی ہے تب انھوں نے روئے خطاب بالکل بدل دیا۔ مندرجہ ذیل خوبصورت قطعہ میں "ہند" کے معنی کچھ اور ہیں:۔

اک شوخ کرن، شوخ مثالِ نگہ حور
بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو

جب تک کہ نہ ہو شرق کا ہر ذرہ جہاں تاب — چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں — محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شام سحر کر
(ضربِ کلیم)

اقبالؒ ایسے مبصر کی نظروں سے ہندوستان کا مستقبل پوشیدہ نہ تھا۔ انگریزوں کی تاجرانہ ذہنیت، ہندوؤں کے بڑھتے ہوئے حوصلے یہ دونوں صاف بتا رہے تھے کہ "صاحب بہادر" کا بستر جلد بندھنے والا ہے۔ ایسی حالت میں بقول اکبر مرحوم جب

حکم انگلش کا ملک ہندو کا — اب خدا ہی ہے "بھائی ملّو" کا

مسلمانوں کو اپنی حفاظت کی تدبیر لازم تھی۔ علامہ اقبال نے صرف تخیل پاکستان پیش کی۔ بلکہ اس کے قیام کی بابت بھی صاف لفظوں میں پیش گوئی فرما دی تھی :-

اس ملک میں مسلمانوں کی زندگی بہ حیثیت ایک متمدن قوت کے زیادہ تر اس پر منحصر ہے کہ وہ ایک معین حصہ میں مرکوز ہو کر رہیں ۔ ۔ ۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب ۔ مغربی سرحدی صوبہ ۔ سندھ ۔ بلوچستان یہ سب متحدہ صورت میں ایک سلطنت بن جائیں ۔

میری نظروں میں اس قسم کی متحدہ اسلامی سلطنت تمامی ہندی مسلمانوں یا کم سے کم شمال مغربی مسلمانوں کے لیے مقدر کر دی گئی ہے۔

(خطبۂ صدارت مسلم لیگ ۱۹۳۰ء)

ہندوؤں اور ان کے تنخواہ دار مسلمانوں اور بعض خود غرض عناصر نے جس زور و شور سے تجویز پاکستان کی مخالفت کی، اسے دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا تھا کہ ایک دن یہ تجویز حقیقت ثابت ہو کر رہے گی۔ ۱۹۳۰ء تک ہندی مسلمانوں کا شیرازہ اس درجہ پریشان تھا کہ پاکستان کی تجویز کو شاعرانہ تخیل سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ لیکن علامہ نے مسلمانوں میں اُس مخفی قوت کا بغور مطالعہ کر لیا تھا۔ جو انھیں منزل مقصود پہ پہنچا کر رہی ۔ فرماتے ہیں :-

شامِ غم لیکن خبر دیتی ہے صبحِ عید کی
ظلمتِ شب میں نظر آئی کرن امید کی

مژدہ اے پیمانہ بردارِ خمستانِ حجاز | بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش
نقدِ خودداری بہائے بادۂ اغیار تھی | پھر دکاں ہوتا ہے لبریزِ صدائے ناؤ نوش
ٹوٹنے کو ہے طلسمِ ماہ سیمایانِ ہند[۱] | پھر سلیمی کو نظر دیتی ہے پیغامِ خروش[۲]

[۱] یعنی ہندوؤں کی کوششیں مسلمانوں کو مغلوب رکھنے کی بیکار ثابت ہوں گی [۲] سلیمی ایک عرب معشوقہ

پھر یہ غوغا ہے کہ لاساقی شرابِ خانہ ساز　　دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش
نغمہ پیرا ہو کہ یہ ہنگام خاموشی نہیں
ہے سحر کا آسماں خورشید سے مینا بدوش

(ب) کشمیر جنّت نظیر

ازاں می فشاں قطرۂ بر کشیری
کہ خاکسترش آفرینند شرارے[1]

آبائی وطن و پیدائش گاہ ہونے کے باعث علاّمہ کو کشمیر سے خاص تعلق تھا ع
تنم گلے ز خیابانِ جنّت کشمیر

اس لیے ہندو حکومت میں مسلمانانِ کشمیر پر جو ظلم و جور رہا کیے اس سے علاّمہ خاص طور پہ متاثر تھے ؎

چو بے پروا گزشتند از نوائے صبحگاہِ من
کہ برد آں شورِ مستی از سیہ چشمانِ کشمیری

لیکن علاّمہ اپنے ہم وطنوں سے ناامید نہ تھے۔ ان کی بصیرت افروز نگاہیں کشمیر کی موجود سعیٔ حیات کو بخوبی دیکھ رہی تھیں اور انھیں یقین تھا کہ اگر ان کے ہم وطن ان کے اقوال پہ عامل ہوئے تو ایک دن ان کی حالت بہتر ہو کر رہے گی۔ جہاں کشمیریوں کی بے حسی کا رونا تھا وہاں ان کے روشن مستقبل کی طرف امیدیں بھی تھیں:-

کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ　　کشمیری (جس نے غلامی فطرت ثانیہ بنالی ہے)

---

[1] کشیری، کشمیری کا مرادف ہے۔

جہاں میں اہل ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں

بتے می تراشد ز سنگ مزارے
قبر پرستی میں مصروف ہے۔

بریشم قبا خواجہ از محنتِ او
اس کی محنت کی بدولت سرمایہ دار ریشمی قبا پہنتا ہے۔

نصیبِ تنش جامۂ تارتارے
اور اس کے مقدر میں تن پر پھٹے کپڑے ہیں۔

ازاں می فشاں قطرۂ بر کشیری
اس شراب[1] سے کشیری پر چند قطرے ڈال دے

کہ خاکسترش آفرینند شرارے
تاکہ اس کی خاکستر سے چنگاریاں پیدا ہو جائیں۔

(ج) پنجاب

اگر کشمیر جائے پیدائش تھی تو پنجاب وطنِ مالوف تھا۔ اشعار میں تو کہیں پنجاب کا ذکر خیر نہیں لیکن تقریرات و تحریرات (صفحہ ۵۸) میں ایک نہایت معنی خیز جملہ پنجابی مسلمان کاشتکاروں کے مستقبل کی بابت ہے۔ راقم الحروف اس کی بابت کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ اس حقیقت کا فیصلہ مقامی حالات کے جاننے والے ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے زراعتی حالات کو دیکھتے ہوئے ہمیں اس کی صحت کی بابت مطلق شبہ نہیں رہ جاتا۔ فرماتے ہیں:۔

مسلمانوں کا ہندوستان میں مستقبل (میری رائے میں) کلیتاً پنجابی مسلمان کاشتکاروں کی آزادیٔ حریت پر منحصر ہے۔ (صفحہ ۵۸)

(د) افغانستان

محمود غزنوی (۱۰۱۰ء — ۱۰۳۰ء) کے زمانہ میں افغانستان جس عروجِ کمال پر پہنچا اس

[1] متعدد اشعار میں اس شراب کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے ؎
ز چشمِ امم ریخت آں اشک نابے
کہ تاثیر او گل دماند ز خارے
(پیامِ مشرق)

کی مثال کسی ملک کی تاریخ میں مشکل سے مل سکے گی۔ محمد غوری (۱۱۷۳ — ۱۲۰۶ء)[1] نے بھی قوم افغانیہ کو خوب پھولا پھلایا۔ لیکن اس کے بعد صدیوں تک یہ بدقسمت ملک یا تو اپنے مشرقی یا پھر مغربی ہمسایہ کے دست برد کا شکار رہا۔ ۱۷۰۰ء میں کابل نے پھر کروٹ لی۔ محمود نے اپنے معروف ومشہور ہمنام کی طرح پہلے تو ایرانی فتوحات کا عزم کیا۔ جس کے بیشتر حصہ پر بآسانی قابض ہوگیا۔ لیکن نادرشاہ کے خروج نے افغانوں کو واپس ہونے پر مجبور کیا۔ پھر تو نادرشاہ نے افغانستان پر حملہ کیا اور اس کو تباہ کیا۔ لیکن نادرشاہ کی وفات کے بعد حالات پھر بدلے۔ دُرّانی خاندان برسر اقتدار آیا اور احمد شاہ نے ہرات وخراسان سے لے کر دلّی تک ایک وسیع سلطنت قائم کی (۱۷۴۷ — ۱۷۷۳) ابدالی کی وفات کے بعد پھر ابتری شروع ہوئی جس میں انگریزوں کا کافی ہاتھ رہا۔ ۱۸۴۱ء میں انگریزوں کو سخت ہزیمت کھانی پڑی، مگر ان کی انتقامی ریشہ دوانیاں جاری رہیں۔ امان اللہ آئے تو صرف جانے کے لیے۔ نادرشاہ نے سلطنت سنبھالی اور آج ظاہر شاہ متمکن تخت ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے حکومت افغانیہ کی دعوت پر افغانستان کا سفر کیا۔ بادی النظر میں جو دکھائی دیا اس سے تو بے حد مایوس ہوئے۔ فرماتے ہیں:-

این مسلماں از پرستاران کیست — در گریبانش یکے ہنگامہ نیست
سینہ اش بے سوز وجانش بے خروش — اوسرافیل است وصورِ او خموش

لیکن جو بغور دیکھا تو رائے بدل دی:-

ملّتے گم گشتۂ کوہ و کمر — از جبینش دیدہ ام چیزے دگر
روزہا، شبہا تپیدن مے تواں — عصرِ دیگر آفریدن مے تواں
کار و بارش رانکو سنجیدہ ام — آنچہ پنہاں است پیدا دیدہ ام (مسافر)

[1] اپنے بڑے بھائی غیاث الدین غوری کے دورِ حکومت (۱۱۷۳ء — ۱۲۰۲ء) میں بھی محمد غوری فی الحقیقت حکمران رہا۔

قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

(۸) سرحدی اقوام

سرحدی اقوام کی جنگجو ذہنیت سے علامہ بے حد مسرور تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ان سے کام لیا جائے تو غازیانِ اسلام کے بہترین سپاہی ثابت ہوسکتے ہیں۔ علامہ نے مستقبل کی بابت پیش گوئی کرتے ہوئے ان کو چند نصیحتیں بھی دی ہیں جو بعنوان "محراب گل خاں کے افکار (ضربِ کلیم) میں درج ہیں:-

اے مرے فقرِ غیور فیصلہ تیرا ہے کیا خلعتِ انگریز یا پیرہن چاک چاک

حقیقت ازلی ہے رقابتِ اقوام نگاہِ پیرِ فلک میں نہ میں عزیز نہ تو
رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا اتر گیا جو ترے دل میں لاشریک لہٗ

تری خودی میں اگر انقلاب پیدا ہو عجب نہیں کہ یہ سب چار سو بدل جائے
تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

(۹) ایران

علامہ نے ایران کے سیاسی انقلاب کا بغور مطالعہ فرمایا تھا۔ ان کی بے نظیر ذہانت اور قربانیوں نے جس طرح ملک کی حالت آناً فاناً بدل دی اس کے وہ بے حد معترف تھے۔ دنیائے اسلام میں ایران کی جغرافوی مرکزی حیثیت انھیں تسلیم تھی۔ ان کے سارے کلام میں مجھے صرف ایک شعر ایران کی بابت ملا۔

طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

(ذ) فتنہ مغول چین

اقبالؒ کی پیش گوئیوں میں یہ پیش گوئی نہایت اہم ہے اور نہایت درجہ لائق اعتناء۔ موجودہ واقعات نے (جو چین میں ہو رہے ہیں) اس کی اہمیت اور بھی بڑھا دی ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اصل پیشگوئی پیش کروں۔ چینی مغول کی چند خصوصیات کا ذکر ضروری ہے۔

دُنیا میں کوئی خطۂ ارض بجز چین ایسا نہیں جہاں تعداد پیدائش تعداد اموات سے دُگنی ہو۔ اس کثرت نے جو اقتصادی مسائل پیدا کر دیے ہیں ان کا فطرت نے صرف ایک اور واحد علاج یہ نکالا ہے کہ یہ ملک ہمیشہ خانہ جنگی میں مبتلا رہا کیا۔ ملک اتنا وسیع ہے کہ بجز ایک بار کبھی چینیوں نے بیرونِ چین میں اپنی شہنشاہیت قائم نہیں کی۔ وہ زمانہ چنگیز خاں کا اور اس کے خلفاء کا تھا چنگیز خاں نے اکیس برس کی قلیل مدت میں (۱۲۰۶ء — ۱۲۲۷ء) سارا وسطی چین۔ سائبیریا۔ پنجاب و سندھ مشرقی ایران و مشرقی روس فتح کر کے رکھ دیا۔ قبلائے خاں کے عہد (۱۲۵۷ء — ۱۲۹۴ء) میں پیکن (خان بلیغ) سے سرحد مصر تک۔ مغرب میں اور پیش (ہنگری) تک۔ یورپ میں یہ سب مغول شاہنشاہیہ میں داخل تھا۔ امتداد زمانہ نے انھیں بھی تباہ کیا جس کے بعد یہ پھر اپنے ملک تک محدود رہے اور بعد چندے دوسری شاخوں نے سیادت حاصل کر لی۔ لیکن ان کی خانہ جنگی اپنی حالت پر قائم رہی۔ یہاں تک کہ آج روسی اشتراکی سارے ملک پر قابض ہیں۔

اشپنگلر کا قول ہے کہ یورپ و افریقہ کی فتوحات کا راستہ ایشیا سے ہو کر ہے۔ اس اصول کو ذہن نشین رکھنے کے بعد جس طرح اشتراکی ایشیا میں پھیل رہے ہیں، بخوبی سمجھ میں آجاتا ہے۔ آج چین اشتراکی ہو چکا۔ برما و ملایا میں اشتراکی فتنہ بپا ہے۔ بنگال میں آگ سلگ رہی ہے۔ بھارت و بیچارہ نیپال تک اس کی زد میں آچکا ہے۔ کیا ان واقعات کی رفتار دیکھتے ہوئے یہ پیش گوئی بے جا نہ ہوگی کہ تھوڑے دنوں کے بعد یہ فتنہ مرکوز ہو کر وسط ایشیا سے اٹھے گا اور اس

طرح چنگیز و ہلاکو کی تاریخ (خدانخواستہ) دہرائی جائے گی۔ اس سلسلہ میں علامہ نے ایک شعر فرمایا ہے لیکن اس کے معانی و شئونات دفتروں میں لکھے جا سکتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

از خاک سمرقندے ترسم کہ دگر خیزد
آشوب ہلاکوئے ہنگامۂ چنگیزے

(خ) سلطنت ترکیہ

جنگ عظیم اوّل کے بعد مسلمانوں کی حالت ناگفتنی تھی۔ اُدھر یہ منظر کہ ع "حرم رسوا ہُوا پیر حرم کی کم نگاہی سے" اِدھر یہ عالم کہ ع "غلامی میں نہ کام آتی ہیں زنجیریں نہ شمشیریں"۔ ایسی تاریک فضا میں اقبال ہی کی وہ دور بین نگاہیں تھیں جو یہ دیکھ سکیں کہ ع "کتاب ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے"۔ اور جسے "خون صد ہزار انجم" میں عثمانیوں کے لیے "نور سحر" نظر آیا۔

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اقبال نے جنگ عظیم ثانی سے برسوں قبل ترکوں اور جرمنوں کی بابت جو پیشگوئی کی تھی وہ آج تک صحیح ہے۔

ثباتِ زندگی ایمان محکم سے ہے دنیا میں
کہ ایمانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی

۶۔ اختتام:۔

اس حقیر تالیف کا مقصد واحد یہ ہے کہ اقبالؒ کی محیر العقل پیش گوئیوں کو مدّ نظر رکھ کر مسلمانان عالم بالعموم و مسلمانانِ پاکستان بالخصوص قنوطیت کو اپنی مشعل ہدایت بنا کر ترقی کریں اور اس سلطنتِ خداداد کو جو علامہ اقبالؒ و قائد اعظم کی فکر رسی کا نتیجہ ہے ترقی دیں۔

ثانیہ ملاحظہ ہو:۔ جنگ تیموری شکست آہنگ تیموری بجاست — سر بر ملی آورد از نساز سمرقندے دگر

عشق ہو مصلحت آمیز تو ہے خام ابھی

میں نہ جبری ہوں نہ قدری، میرا خیال و عقیدہ ہے کہ زندگی قومی بالکل قوم کے ہاتھوں میں ہوتی ہے ع اگر ہو سعیٔ پیہم تو بدل جاتی ہیں تقدیریں۔" افراد مقدرات کا شکار ہوتے ہیں اور ان مقدرات میں بھی زیادہ تر وہ مجبوریاں شامل ہوتی ہیں جن پہ افراد اپنی قوم کی بداعمالیوں کے باعث اپنی انفرادی کوشش سے قابو نہیں پا سکتے۔ خدائے کریم نے آیندہ کے واقعات کا اندازہ کرنے کے لیے ہزاروں ذرائع بیرونی و اندرونی پیدا کیے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک صاحب دل کی پیش گوئی بھی ہے۔ اسے آپ وحی نہ سمجھیں۔ لیکن قابلِ اعتبار ضرور ہے۔ اقبالؒ کی پیش گوئیاں اکثر پوری ہوتی دکھائی دے رہی ہیں۔ کیا عجب ہے کہ ہماری کوشش پیہم سے یہ بھی سچ نکلے۔

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

ضمیمہ (الف)

علامہ اقبالؒ کی مخصوص منظوم پیش گوئیاں[1]

---

[1] گو ان نظموں کے چند اشعار متن میں جا بجا دیے گئے ہیں لیکن قارئین کی دلچسپی کے لیے ہر سہ نظمیں اپنی مکمل صورت میں یہاں درج کی جاتی ہیں۔

(۱) عزم بالجزم

جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

ہویدا آج اپنے زخمِ پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا

جلانا ہے مجھے ہر شمعِ دل کو سوزِ پنہاں سے
تری تاریک راتوں کو چراغاں کر کے چھوڑوں گا

مگر غنچہ کی صورت ہوں دلِ درد آشنا پیدا
چمن میں مشتِ خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

مجھے اے ہمنشیں رہنے دے شغلِ سینہ کاوی میں
کہ میں داغِ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا

دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
تجھے بھی صورتِ آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا

(۲) رازِ آشکار

شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

۱

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گی میخانہ ساری دُنیا، ہر اک کوئی بادہ خوار ہوگا

کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آ بسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی مگر نیا خار زار ہوگا

سنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

کیا مرا تذکرہ جو ساقی نے بادہ خواروں کی انجمن میں
تو پیرِ میخانہ کہنے لگا کہ منہ پھٹ ہے خوار ہوگا

۲

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہی زر کم عیار ہوگا

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

۳

سفینۂ برگ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

جو ایک تھا اے نگاہ تو نے ہزار کر کے مجھے دکھایا
یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہوگا

کہا جو قمری سے میں نے اک دن یہاں کے آزاد پابگل ہیں
تو غنچے کہنے لگے، ہمارے چمن کا یہ رازدار ہوگا

۴

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

یہ رسم بزم فنا ہے اے دل! گناہ ہے جنبشِ نظر بھی
رہے گی کیا آبرو ہماری جو تُو یہاں بے قرار ہوگا

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

۵

نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
تو اک نفس میں مٹنا تجھے مثال شرار ہوگا

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا، ابھی وہی کیفیت ہے اُس کی
کہیں سر رہگذار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا

(۳) سوز و سازِ فردا

یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچہ کی ہوا ہو جائے گی

آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی

شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی

دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اُسے زنجیرِ پا ہو جائے گی

پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

ضمیمہ (ب)

تلخیص

مستقبل اسلام

مصنّفہ

ولفرڈ اسکاون بلنٹ

(مترجمہ)
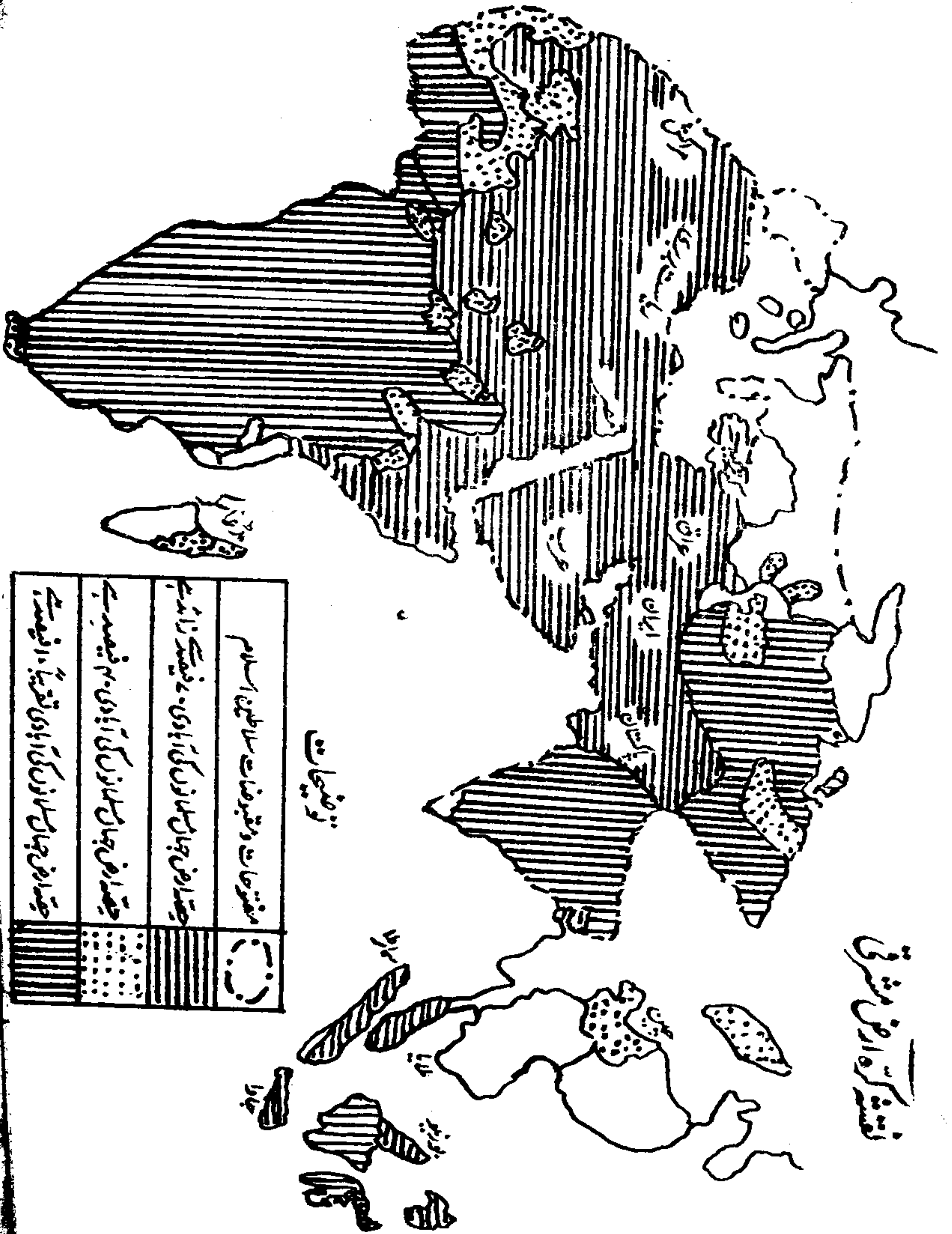
نقشہ کرہ ارض مشرقی
مراکش
ریاست بربری
مصر
عراق
ایران
عرب
پاکستان
چین
ملایا
بورنیو
سماٹرا
جاوا
توضیحات
مفتوحات ومقبوضات سلاطین اسلام
حصہ ارض جہاں مسلمانوں کی آبادی ۷۰ فیصد سے زائد ہے
حصہ ارض جہاں مسلمانوں کی آبادی ۴۰ فیصد ہے
حصہ ارض جہاں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۱۰ فیصد ہے

تمہید

بلنٹ اُن چند ایماندار انگریزوں میں گزرا ہے جنھوں نے اسلام کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس کی بابت رائے قائم کی ہے۔ اس کی مشہور زمانہ تصنیف مستقبل اسلام (FUTURE OF ISLAM) پہلی بار ۱۸۸۲ء میں شائع ہوئی۔ جس کا اردو تقریباً تحت اللفظ ترجمہ اکبر حسین الہ آبادی مرحوم نے مارچ ۱۸۸۴ء میں شائع کیا جو خوش قسمتی سے میرے پیش نظر ہے۔ افسوس ہے کہ باوجود سعیٔ بلیغ میں آج تک اصل کتاب نہ دیکھ سکا۔ یہاں تک کہ مجھے برٹش میوزیم میں بھی یہ کتاب دستیاب نہ ہو سکی۔ ہماری موجودہ ضروریات کے لحاظ سے اس کتاب میں چند ایسے مبحث بھی ہیں جو غیر ضروری ہیں۔ مثلاً مسئلہ خلافت، اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ ترجمہ کو پیش نظر رکھ کر اس کا مفید حصّہ بطور خلاصہ قارئین کے سامنے پیش کروں۔ علامہ اقبالؒ کی پیش گوئیوں پر مکمل بحث کی گئی ہے۔ اس کی روشنی میں بلنٹ کے تائیدی خیالات ہماری امیدوں کو قوی کرتے ہیں۔ اس میں بعض حصّے ضرور ایسے ہیں جو محتاجِ تنقید ہیں۔ مثلاً "مسلمانوں میں اصلاح کی گنجائش اور اس کے طریقے" مگر میں اس پر بحث کر کے خواہ مخواہ اس رسالہ کو مطول کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ میں بلنٹ کی مجوزہ رائے سے بہت کم متفق ہوں۔

مسلمانوں میں نوّے فیصد مفلس ہیں۔ نو فیصد بمشکل اپنی ضروریات کو پورا کر سکتے ہیں۔ ایک فیصد میں بھی اعشاریہ حصّہ خوش حال کہا جا سکتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ فطری اصول کے لحاظ سے افلاس اس انتہا کو پہنچ چکا ہے جب ؎

توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری

لیکن موسیٰ ایمان سے نہیں بھٹکتے۔ قرآن مجید کا اصول تو یہ ہے کہ؎

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

مگر یہاں ع

ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہیں

پھر ایسے طبقہ سے جو "جانور نہیں بلکہ جانور سے بدتر" ہے کسی اندرونی اصلاح کی امید غلطی ہے۔ متوسط الحال طبقہ اوّل تو اس کشمکش حیات میں مبتلا ہے۔ جس میں اسے دنیا میں اپنے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔ امراء کا خوش حال طبقہ ع

مست مئے پندار تن آسانی ہے

ان حالتوں میں بجز اس انتظار کے اور کیا چارہ ہے ع

آوازۂ حق دیکھیے آتا ہے کدھر سے

بایں ہمہ میں مسلمانوں کے مستقبل سے نا اُمید نہیں ع

ہے بھروسہ اپنی ملّت کے مقدر پر مجھے

"اتمام توحید" خدا کا مقصودِ تخلیق ہے اور وہ اسے حاصل کر کے چھوڑے گا ع

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

مجھے امید ہے کہ قارئین بلنٹ کے خیالات کو بغور ملاحظہ فرمائیں گے اور گو اس تصنیف کو مرتب کیے ہوئے ساٹھ سال سے زائد ہوئے لیکن اس کی مبصر آنکھیں جو کچھ دیکھ چکی ہیں وہ پردۂ شہود پر آتا جا رہا ہے۔

(ہاشمی)

(۱) اسلام کا مستقبل

اسلام ہر طرف سیاسی بدفالیوں سے جن کی شدت اور سختی ہر طرف بڑھتی چلی جا رہی ہے تہہ و بالا اور پیچ و تاب میں نظر آ رہا ہے مصنف کو اسلام پر کامل اعتماد ہے کہ نہ صرف روحانی بلکہ مادی طرق و وسائل (جو ورثہ اور عطیہ نسل عرب ہے) اُن کی خواہشات کو پورا کر سکیں گے اور اُس وقت مسلمانوں کی سیاسی قوت عود کرے گی۔ اُن کی شاہنشاہی کا دن تو ضرور گزر گیا لیکن ان کی سوشل آزادی کے دن (جو شہنشاہی سے بہتر ہے) ابھی باقی ہیں۔

اسلام کی حالت آیندہ کا قیاس اس بات پر مبنی ہے کہ وہ کن اجزا رشخصی سے مرکب ہے۔ مغربی نگاہوں میں محمدیت صرف سلطنت عثمانیہ تک محدود رہی۔ لیکن جدہ پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس سے باہر بھی ایسی قومیں ہیں جن کے آگے ترکیہ کسی شمار میں نہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کی عظمت کا مرکز گویا شمال و مغرب سے جنوب و مشرق کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ اسلام کی شرعی راہ گو پختہ سڑک نہیں ہے لیکن سب ایک ہی سمت کو رواں ہیں اور جہاں کہیں سخت زمینوں میں کوئی سلسلۂ کوہ حائل ہو گیا ہے یا جہاں کوئی تنگ گھاٹی آ گئی ہے وہاں سب فرقے مل جاتے ہیں۔ اگر اسلام نے کروٹ بدلی تو وہ مذہبی لڑائی کا پیرایہ اختیار کرے گا۔ اس حالت میں افریقہ کی نسلیں[1] آگے آگے رہیں گی۔

"تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔" یہ قرآن واعظ کے ہاتھوں میں ایسی رشوت ہے جس کا وار خالی نہیں جاتا۔ اسلام اپنے خزانہ سے حامؑ کی اولاد کے سامنے اس قدر نعمتیں پیش کر سکتا ہے کہ ان کے دلوں کو جیت لینا آسان ہے جو کسی طرح عیسائیت یا یورپی تہذیب کو حاصل نہیں۔ پس وسط افریقہ بھی اسلام کے حصّہ میں آیا چاہتا ہے اور اس کے لیے زیادہ زمانہ درکار نہیں۔ آج مسلمانوں کا دور اندیش طبقہ اتحاد اسلامیہ کا بے حد مؤید ہے اور اگر ایسا ہوا تو اسلام کو اپنی اخلاقی

[1] نوحؑ کے فرزند جن سے حبشی اقوام ہیں۔

اصلاح کا کافی موقع مل سکے گا۔

(۲) اِسلام میں اِصلاحات کی گنجائش

ایک سوال یہ ہے کہ آیا اسلام میں سیاسی و اخلاقی اصلاحات کی گنجائش و امکان ہے یا نہیں؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو ہماری ساری پیش گوئیاں غلط ثابت ہوں گی۔ مسلمانوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جس دشمن کا انھیں مقابلہ کرنا ہے وہ قوی بھی ہے اور ہوشیار بھی اور وہ کبھی اسے چین نہیں لینے دے گا۔ ہر سال جو گزرتا ہے وہ اسلام کی خلوت گزینانہ خصوصیت کو کم کرتا جاتا ہے اور خواہ مخواہ اسلام کا سامنا اس کے قدیم دشمن فرانسیسی، روسی، جرمنی، چینی اور امریکائی لوگوں سے ہوتا جا رہا ہے۔ پس باری باری سے ایک نہ ایک دن اسلام کو ان سے دوچار ہونا ہے۔ اگر اسلام چاہتا ہے کہ ایسے ایسے رقیبوں میں پڑ کر بھی اس کا دم نہ گھٹے تو اس کا فرض ہے کہ وہ جسمانی طاقت ہی سے نہیں بلکہ دوسری طاقتوں سے بھی کام لے۔ اور اپنے ہم سرحدوں کی باطنی اور عقلی حملوں کا مقابلہ اُسی طرح کی طاقتوں سے کرے۔ ورنہ زوال اسلام لازمی ہے جو سیاسی اور روحانی دونوں طرح کا ہوگا اور اس کی وقعت محض خیالی رہ جائے گی اور اسلام جو اس وقت ایک جیتی جاگتی تصویر ہے اور اپنے ساتھ اخلاقی قوت رکھتا ہے کبھی زائل نہ ہوگا۔ آج مستند رائے یہ ہے کہ اسلام کی تقدیر میں بربادی لکھی ہے۔ لیکن مجھے اس سے بالکل اختلاف ہے۔ اسلام جنبش کر رہا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام میں روز افزوں ترقی یافتہ زندگی کی اہلیت ہی نہیں ہے اور قرآن کا قانون مردہ کی طرح سرد اور اکڑا ہوا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ یہ باتیں پچاس سال قبل صحیح مانی جاتی تھیں۔ لیکن اب یہ صحیح نہیں ہیں۔ مصلحین میں سیاسی سازش کرنے والے ہی نہیں ہیں بلکہ بے ریا اور خدا پرست ہستیاں بھی ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ مسلمانوں میں سیاسی اصلاحات کی طرح اخلاقی اصلاحوں کی بھی کوشش ضروری ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ فرائض مذہبی کی ادائیگی پر زور دیا جائے اور اس کی بنیاد وسیع کی جائے تاکہ مسلمانوں کی عقل کو مسائل کی پیچیدگیوں کے پھندے سے نکالا جائے۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ قرآن کا اعلیٰ قانون جو اتنی مدت سے شکست

پارہا ہے پھر نافذ کیا جائے ۔

اس تجویز میں یہ لوگ پندرھویں صدی کے یورپین عیسائیوں کی طرح ہیں ۔ اس لیے ہمیں یقین ہے کہ اسلام بھی اپنے لیے اصلاح حالت کرلے گا ۔ یورپ میں مذہبی اصلاح کی دو محرکات تھیں (۱) غربا کی مصیبت اور (۲) تعلیم کی عمومیت ۔ مسلمانوں میں بالکل ویسے ہی حالات موجود ہیں جو یورپ میں تھے یعنی جنگ و فساد حکام کی نفس پرستی اور عیاشی، محکوم فرقہ کی بےبسی اور مظلومیت اور سب سے زیادہ مذہب کی طرف سے علامانہ سکوت ۔ مسلمان دیکھ رہے ہیں کہ ان کی تمام دنیا بداعمال ہوگئی ہے ۔ قانون ساز خود قانون شکن ہیں اور علماء چشم پوش و خاموش ۔ وہ اس کو بھی جانتے ہیں کہ غلامی انسان کی طبعی حالت نہیں ہے اور نہ صحیح مذہب کا یہ کام ہے کہ بدی پر رضامند ہو جائے اور جو کچھ ان پر گزرتی ہے اس سے وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اسلام کے عمدہ قانون پر ستم ڈھایا جارہا ہے ۔

اسلام میں ہنوز داغِ کفر و الحاد نمایاں ہوتا معلوم نہیں ہوتا ۔ بہ استثنار چند منافقین یا مغرب زدہ بے دینوں کے اسلام میں منکرین کا وجود نہیں ۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے فرائض سے غافل ہو یا گناہگار ہو اور بدترین اخلاق کا حامل ہو اور یورپی طرز معاشرت کا پیرو ہو ۔ لیکن وہ مذہبی تحقیر و خدا کی بے ادبی کبھی نہیں کرسکتا ۔ بہر نوع اسلام میں اس کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے کہ اس دین کی زندگی جاتی رہی ۔ اگر دیگر طبائع کے لیے نہ سہی تو کم سے کم یہ مذہب عربی الطبع اقوام میں ابدی و دائمی ثابت ہوگا ۔

اسلام اپنے سادے پیرایہ میں صرف ایک تاکیدی تجدید اس ملت سامیہ کی ہے اور جب تک سامی نسل دنیا میں قائم ہے یہ باقی رہے گا اور کسی زمانہ میں اس کے اعتقادات میں خلل نہیں پڑے گا ۔ انبیاء کے گروہ میں محمدؐ ہمیشہ ممتاز رہیں گے ۔ کیونکہ وہ نہایت ہی مدبر قوم پرست رہے ۔ اسلام کا قانون بھی ہمیشہ اُن کا قانون رہے گا ۔ کیونکہ وہ ان کے دستورات سیاسی و معاشرتی کا ایک مجموعہ ہے ۔ سامی خیال ایک قومی ضمیر ہے جس نے ہر جگہ قوموں کی طبائع میں اچھی طرح گھر کرلیا ہے اور وہ کسی طرح زائل نہیں ہوسکتا ۔

(۳) اسلام کون سا طریقۂ اصلاح اختیار کرے گا؟

مجھے تو دو طریقے نظر آتے ہیں جن سے اسلام اپنی روحانی زندگی کو تازہ کرنے کا قصد کرے گا:۔

۱۔ ایک سخت اور جابرانہ طرز عمل۔ لیکن شاید ہی یہ مستقل طریقہ ہو۔

۲۔ دوسرا طریقہ حل مشکلات کا یہ ہے کہ ظہور مہدی کا انتظار کیا جائے[1]

۳۔ اگر ہادی برحق اور ملہم غیب ہونے کا دعویٰ نہ بھی کیا جائے تو کچھ شبہ نہیں کہ کوئی لائق اور عالی ہمت شخص موجودہ نازک حالت میں حسب ضرورت اصلاح و تقویٰ اس کی بہ آسانی ترغیب دے سکتا ہے کہ اسلام کو جنگ سے مفر نہیں اور اسی سے مسلمانوں کو غلبہ و تفوق حاصل ہوگا۔ اس بنیاد پر اصلاح آسان ہوگی۔ لیکن یہ اصلاح بھی سچی اصلاح نہ ہوگی اور نہ ہر جگہ قابل عمل ہو سکتی ہے۔

گو جزیرہ نمائے عرب کے باشندے اپنے زہد و تقوے کی اصلاح کر چکے ہیں اور ان میں ایک قومی حرکت آزادی کی طرف شروع ہو گئی ہے لیکن وہ یہ اصلاح نہیں ہے جسے عبدالوہاب نے شروع کیا تھا بلکہ پُرامن اصلاح ہے۔ ایسی حالت میں یہ امر مشتبہ ہے کہ ایک نیا جنگ پسند اسلام ان لوگوں میں اپنا ہم خیال پائے گا یا نہیں۔ آج مکہ میں جنگ کے حامیوں میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو ۱۸۵۷ء میں) ہندوستان چھوڑ یہاں آ بسے ہیں۔ یہ نہایت متعصب اور نامور ہیں۔

۴۔ میں اس کا اقرار کرتا ہوں کہ اسلام کو ان ہر سہ طریقوں میں کسی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہ اپنی اصلاح آپ کرلے گا۔ اس کی اصلاح شروع ہو گئی ہے اور رفتہ رفتہ بلا جبر و اکراہ یہ مکمل ہو جائے گی۔ اس کی یہ اصلاحات اس طرز کی نہ ہوگی کہ وہ قدیمی حالت کی طرف بازگشت کرے بلکہ اس کا میلان ترقی روزافزوں کی طرف ہوگا۔ اسلام میں کوئی ایسا نقص نہیں ہے جس سے ہم اس راستہ میں اس کے لیے کوئی مشکل پائیں۔ اسلام ابتدا میں عمدہ اور صاف عقل پسند مذہب تھا اور اسلام نے جو روحانی فتوحات حاصل کیں وہ نہ صرف

[1] اس کے بعد مصنف نے خیال مہدویت کی طویل اور بے معنی تاریخ دی ہے جو سراسر خلاف عقل ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ اس ایرانی تخیل نے مسلمانوں کو بے حد نقصان پہنچایا ہے" ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو" اسی کی بابت کہا گیا ہے۔

عقائد پر مبنی تھیں بلکہ عقل و تمیز کے ذریعہ سے بھی حاصل کیں۔ آج عام مسلمان پھر ایک مرتبہ طریقہ ہائے عقل و ادراک کی طرف مائل ہو چکا ہے اور باطنی زندگی کے عود کرنے کے پورے پورے آثار ٹھیک ٹھیک ہم کو انھیں ممالک اسلامیہ میں دکھائی دیتے ہیں جہاں عرب کا خیال سب سے زیادہ قوی ہے۔ اب تک جہاں کہیں بھی عربی ذہنیت کو مغربی تہذیب سے دوچار ہونا پڑا وہاں عربی ذہنیت نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ اس سے اچھی باتیں حاصل کر سکتا ہے۔ جس طرح اوائل میں مسلمانوں نے یونانیوں کے فلسفہ کو اپنا لیا اسی طرح آج مغربی تہذیب کو یہ لوگ اپنے مجموعۂ اخلاق میں شامل کر رہے ہیں۔ اگر عرب کے خیال کو اسلام میں پھر غلبہ و تفوق حاصل ہوا تو اس خیال کا میلان وسیع تر اور آزاد تر تعمیر ملت و شرع کی طرف ہوگا اور اس طرح بہت ممکن ہے کہ عیسائیت سے میل و موافقت پیدا ہو جائے۔

آج مذہب اسلام کو اس کی سخت ضرورت ہے کہ وہ یورپ کے ساتھ شرعی جواز کی بنا پر رسم و رواج پیدا کرے اور جن امور پر یورپ کو اصرار ہے اُن سے اپنے قانون کو اس طرح متعلق کر سکے کہ مخالفت دور ہو جائے مجھے امید ہے کہ قرآن کے وسیع معانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ مشکل راستہ میں نہیں پڑے گی۔

۴۔ اسلام کے اجزائے ترکیبی

مراکشی مسلمانوں کو مداومت نصیب ہوگی۔ اس لیے کہ مذہب اسلام کی شاخوں کے پھیلاؤ کے لیے وہ موزوں ترین مقام ہے اور بیشک وہاں دائرہ اسلام وسیع ہوتا رہے گا۔

حنفیوں اور مالکیوں کے نزدیک سرچشمۂ تحقیق بند ہو گیا ہے لیکن شوافع ایک نئے مجتہد کی جستجو کی طرف مائل ہیں جو اسلام اور دنیائے موجودہ میں موافقت پیدا کرے۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام کی پولیٹیکل عظمت جاتی رہی۔ جس کا کوئی نہ کوئی پوشیدہ راز ضرور ہے۔ پس ان کی خواہش ہے کہ اسلام کو پھر ایک دفعہ بالاتر دیکھیں۔ ان کا برتاؤ بھی غیر مسلموں کے ساتھ بہتر ہے اور وہ سب کو خدائے واحد کی پرستش میں اپنا شریک سمجھتے ہیں۔

ہندوستان کو مکہ سے اس وقت قریب ترین تعلق ہے اور یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ

بہ نسبت دیگر امور کے زیادہ تر ہندوستان ہی کی صورتِ معاملات پر اس امر کا تصفیہ منحصر ہوگا کہ آیندہ اسلام کی قسمت میں کیا لکھا ہوا ہے۔ اہلِ ملایا زیادہ تر شافعی ہیں اور ان کا میلان طبع اسلام کے وسیع اور فراخ تر طریقوں کی جانب ہے۔ چینی مسلمان گو کمزور ہیں لیکن یہ بھی ایک دن اپنا اثر ضرور دکھانے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ چین مردہ قوم نہیں ہے صرف سو رہی ہے۔

عامۃ الناس شیعوں کی آیندہ حالت کا تعلق اسلام کے مستقبل سے غیر صریحی ہے۔ گو ایران میں بالخصوص یہ عام عقیدہ ہے کہ عنقریب اسلام کا ظہور شائستہ ہوا چاہتا ہے اور معلوم نہیں کب اور کدھر سے ہو۔ لیکن یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ سُنّی و شیعہ کی آپس کی عداوتیں قابلِ احساس طور پر کم ہو رہی ہیں۔

ایران :۔ ایران میں شیعیت کا مستقبل ایک مشتبہ مبحث ہے۔ ایران روس کے مطیع ہونے سے بچ نہ سکے گا۔ لیکن خود ایرانی روس میں جذب نہیں ہو سکتا۔ بہ استثنائے عربوں کے۔ ایرانی تمامی دیگر مسلمان نسلوں سے ممتاز ہیں۔ ترک اگرچہ فاتح رہے لیکن اب تک لقب "ترک" سے دست بردار ہیں اور خود کو صرف مسلمان کہتے رہے۔ لیکن ایرانی ہر حالت میں ایرانی بنا رہتا ہے اور محمدیت کو اس نے اپنے لیے خود اپنا بنا لیا ہے۔ اس کو اپنی تاریخ و ادب پر (جس کی عمر اسلام سے کہیں زیادہ ہے) ناز ہے اور وہ اس بات پر رضامند نہیں ہے کہ انھیں جاہلیت کی نشانیاں سمجھ کر بھلا دے۔

پس ایران کو اس بات کا بہت کم خطرہ ہے کہ وہ بعد فتح روسی یا عیسائی ہو جائے گا۔ اور چونکہ باطنی قوتوں میں وہ روسیوں پر فوقیت رکھتا ہے (اور جہاں تک کثیر آبادی کا تعلق ہے ان کے قوائے جسمانی بھی ایسے ہی ہیں) اس لیے یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اگر وہ سیاسی اطاعت سے نہیں بچ سکتا تو وہ اپنی ہستی ضرور قائم رکھے گا۔ قسطنطنیہ کی طرح ایران میں محمدیت مانع اصلاح نہیں پائی جائے گی۔ کیونکہ ایرانی تشیع ایک نہایت ہی لچکدار مذہب ہے۔ بلکہ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ وہی ذریعہ سوشل اصلاح کا قرار پائے۔

(۵) وہابی موحدین

گزشتہ صدی کا پہلا نصف حصہ اسلام کے لیے نہایت جمود و سکون کا تھا۔ مسلمانوں کے عقائد اس درجہ پست ہو گئے تھے کہ مغربی عقلا کا خیال تھا کہ یہ بہت جلد مبدل بہ کفر ہو جائے گا۔ لیکن دفعتاً وہ جاگ اٹھا اور ایک نوجوان کی طرح پھرتن کر کھڑا ہو گیا۔ یہ عبدالوہاب نجدی تھا۔ جس نے ایک نئی ملت کی بنیاد ڈالی۔ اس نے "موحدین"[1] کا لقب دیا۔ یہ مسلک بہت جلد ساری دنیائے اسلام میں پھیل گیا۔ لیکن وہابیوں کی دو غلطیوں نے اس کی تکمیل کو ختم کر دیا (۱) اول یہ کہ اس میں ترقی جدیدہ کا مطلق خیال نہ تھا۔ اس نے صرف مذہبی کامیابی مدِ نظر رکھی، سیاسی کامیابی نظر انداز کر دی (۲) دوسری غلطی یہ تھی کہ اس نے پیغمبر علیہ السلام کے شعار کے خلاف چھوٹی چھوٹی باتوں پر خواہ مخواہ درشتگی اختیار کی۔ یہاں تک کہ خود رسول اللہ کے مقبرہ کو ویران کر دیا اور اس کا خزانہ لوٹ لے گئے۔ ابن سعود کے قسطنطنیہ میں قتل کے بعد یہ تحریک سو برس کے لیے ملتوی ہو گئی۔ تاہم عبدالوہاب نے جو بیج بویا وہ بالکل بے برگ و بار نہیں رہا۔ وہابیت بہ حیثیت سیاسی نظام ناکام رہی۔ لیکن اصلاح کا جوش پیچھے چھوڑ گئی۔ بیشک اسلام میں جو امید مستقبل بے چینی کے ساتھ پائی جاتی ہے وہ اس کا مبہم نتیجہ ہے۔ اسلام اب جاگ اٹھا۔ اگر دوسرا عقل مند وہاب اٹھا اور درجۂ اعتدال پر رہا تو بہت ممکن ہے کہ اسے کامیابی حاصل ہو۔

(۶) مرکزِ اسلامیہ

قدیم زمانہ کی پیش گوئیوں اور حال کے خیالات' دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ علم خلافت کا ایشیا کی طرف بازگشت کرنا قریب الوقوع ہے اور ترکوں کا خاتمہ ہوا چاہتا ہے اور اس وقت اسلام کی تبدیلیاں مائل بہ قبض ہوں گی نہ مائل بہ بسط یعنی اسلام پھیلے گا نہیں بلکہ سمٹے گا اور ایک مرکز کی جانب رجوع ہو گا۔ یہ سب سمجھ رہے ہیں کہ فتح کے دن گئے' اب یا تو موجودہ حالت کا استحکام یا زیادہ سے زیادہ ہندوستان اور جنوبی افریقہ

---

[1] اصل متن میں "موحدین' افریقہ کا ذکر ملاحظہ ہو۔

کے نکلے ہوئے صوبوں کو واپس لینا ہو سکتا ہے اور بس - جہاں ترک کمزور ہوتے ہیں کہ فوراً عرب میں آزادی کی جنگ شروع ہو جائے گی -

یہ یقین ہے کہ جب کبھی اعلیٰ حکومت اسلامیہ کا صدر منتقل ہوگا تو وہ انتقال کسی ملک اسلامیہ کی نئی حد انتہا کی جانب نہیں بلکہ مرکز کی جانب ہوگا - خود سلطان عبدالحمید دمشق یا بغداد کے تصوّر میں ہیں - لیکن عوام قاہرہ پسند کر رہے ہیں - برخلاف اس کے مسلمانوں کا عقلمند طبقہ یہ خیال کرتا ہے کہ یہ پسپائی بڑھتی ہی چلی جائے گی - اس لیے وہ دینی حکومت کا اصلی مستقر سرزمین عرب کو قرار دیتے ہیں کیونکہ نہ صرف وہ اصل مولد و سرچشمہ الہام ہے بلکہ وہاں نہ عیسائی ہیں نہ یہودی جن سے اسلام کا مقابلہ ہو اور نہ وہ ایسا زرخیز ملک ہے کہ شاہان مغرب کی حرص آمیز آنکھیں اس پر پڑیں - وہاں کسی یورپین سفیر کی نصیحت و دباؤ کا خوف نہ ہوگا - پیغمبر کے جانشین کو جس آزادی کے ساتھ عمل کرنا چاہیئے وہ آزادی اسے حاصل ہوگی اور خالص اسلام کی پاکیزہ ہوائیں اسے میسّر آئیں گی - لہٰذا قیاس ہے کہ آئندہ مرکز اسلام مکّہ یا مدینہ کی طرف منتقل ہو -

۷ قیادتِ مسلمین کس ملک کو نصیب ہوگی؟

با ایں ہمہ ان لوگوں کے خیالات قابلِ اعتنا ہیں جو مرکز اسلامیہ کو مکّہ و مدینہ کے علاوہ دوسری جگہ منتقل کرنے کی فکر میں ہیں - اس لیے ہمیں دیکھنا ہے کہ اس کے لیے کون سی جگہ زیادہ موزوں ہے -

۱ - **ریاست بربریہ (افریقہ)** :- اگر عبدالقادر کی طرح کوئی ایک شخص ظہور کرے جو ولی بھی ہو اور واعظ بھی ہو اور سپاہی بھی ہو اور مقامی حکومتوں کے چھوٹے چھوٹے منصوبوں کی کچھ پروا نہ کرے اور جنگی قابلیت اور سچّا زہد و تقویٰ رکھتا ہو تو میری دانست میں وہ کامیابی حاصل کرے گا - اس لیے کہ افریقہ میں ایسے اجزا شامل ہیں جس سے کسی مسلمان فرماں روا کی نئی سلطنت قائم ہو کر مکّہ تک پہنچ سکتی ہے اس لیے کہ یہ بہت ممکن ہے کہ سوڈان کی کثیر التعداد آبادی اور مالکی عربوں کی مہیب فوج اس کی معاون ہو - لیکن اس مفروضہ کے لیے ہم کو بہت سی باتیں بلا دلیل ماننی پڑیں گی - اس لیے ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں -

۲۔ مصر:۔ قاہرہ نے خود کو روز افزوں ترقی پذیر خیالاتِ اسلامیہ کا معدن و مرکز بنا رکھا ہے۔ اور اپنے دار العلم کو دوبارہ آزاد و خود مختار، اہلِ عرب کے علمِ دینیات کا منشر قرار دیا ہے۔ اس لیے اگر مصر میں آزاد حکومت اسلامیہ ساحلِ نیل پر قائم ہو گی تو بلاشبہ وہ تمام عالم اسلامیہ کی معاشرتی و سیاسی قیادت کے لیے ایک مستحکم بنیاد ثابت ہو گی۔ آج بھی خلافتِ ترکیہ کے جلوائے زوال کے بعد یہ خیال اکثر حلقوں میں پایا جاتا ہے کہ خلافت قسطنطنیہ سے قاہرہ کی طرف رجوع ہو گی۔

۳۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی بھی یہی حالت ہے۔ شاید وہ مسلح یورپین گورنمنٹ کے مخالف ہو جائیں اور اگر انگریزوں کی ناقابل فہم حکمت عملی یوں ہی رہی تو ضرور ایسا ہو گا اور اس وقت ان کے لیے ممکن ہو گا کہ اسلام کی نگاہوں میں قائدانہ پوزیشن قائم کر لیں اور اگر حیدر آباد یا دلّی میں پھر ایک اسلامی سلطنت قائم ہوئی تو ہندوستان یقیناً ایک عمدہ ترین دار الاسلام بن جائے گا۔ اور اس وقت یہ ملک تمام دیگر ممالک اسلامیہ سے کہیں زیادہ آباد اور دولتمند ہو گا اور مکّہ کو تخیلی کھینچنے میں سب پر سبقت لے جائے گا اس وقت ہندوستان کی جائداد منقولہ کی مالیت جائداد منقولہ عثمانیہ کے مساوی سمجھی جاتی ہے اور اس وقت یہ آمدنی گورنمنٹ کی حمایت میں آجائے گی۔

لیکن یہاں بھی بُعد مسافت حارج ہے اور سخت موانع میں ہے۔ ہندوستان اسلامیہ سے مکّہ کی وہ حمایت و حفاظت ہرگز نہیں ہو سکتی جس کی اسلام کو ضرورت ہے اور اسلام بجز اپنے مقام خاص کے اور کہیں اپنی سلطنت کا اظہار نہیں کر سکتا اور اپنے مقام پر ہی مسلح رہ کر سلطنت کر سکتا ہے۔

پس خاندان عثمانیہ کے جانشین ہونے کی صلاحیت امکان نہ بربری ریاستوں میں ہے اور نہ ہندوستان میں۔ ظاہرا وزارتِ مصر پر آنکھیں پڑتی ہیں۔ اگر کوئی محمد توفیق کے دادا کی طرح ہوشیار نکلا تو ممکن ہے کہ مکّہ میں ایک قوی حریف سلطان کا بن جائے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر شریف مکّہ کے خاندان میں سچی لیاقت کا کوئی شخص نمودار ہوا تو ساری دنیائے اسلام اس کے ساتھ ہو گی۔ قسطنطنیہ سے مکّہ کو مذہبی دار الخلافہ کا منتقل ہونا ایک آسان اور طبعی امر ہے اور یہی آج کل تمام مسلمانوں کی صدا و خواہش بھی ہے اور اسی سے مسلمانوں کی مذہبی زندگی کے تر و تازہ ہونے کی امید ہے اور گو اس خیال کی تکمیل میں بے حد رکاوٹیں

ہوں گی۔ مگر جیسا کہ یورپ میں ہوا یہ اسلام میں بھی رک نہیں سکتا۔

۸ یورپ و اسلام

حالاتِ حاضرہ کے اہم واقعات سے بے اعتنائی صرف اس بنا پر ہے کہ ان سے ہماری روزانہ زندگی کے مشاغل سے کوئی گہرا تعلق نہیں، سخت غلطی ہے جو کبھی ایک عظیم الشان قوم کے شایانِ شان نہیں۔

ان تبدیلیوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جو عنقریب مغربی ایشیا میں ہونے والی ہیں۔ انگلستان کو چاہیئے کہ وہ اپنی پالیسی میں تبدیلی کرے۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ وہ ایشیا کا رہنما اور سرپنچ بنا رہے۔ فرانس کی حکمتِ عملی یہ ہے کہ وہ اپنے صوبہ کو بقیہ دنیائے اسلام سے الگ تھلگ رکھے اور گوشۂ عزلت میں پڑا رہے۔

یورپ مسلمانوں کو عیسائی بنانے سے اسی طرح ناامید ہو چکا ہے جس طرح اسلام یورپ کو دوبارہ فتح کرنے سے۔ یقیناً اب وہ وقت آ گیا ہے کہ یہ دو بڑے گروہِ انسانی جو ایک ہی خدا کے پرستار ہیں متحد ہو جائیں۔ اسلام ایک حقیقت ہے جو بُرائی یا بھلائی کے ساتھ دنیا میں قائم رہے گی۔ خواہ یورپ کی مرضی ہو یا نہ ہو۔

عیسائی یورپ نے جو اصول اوائل میں ٹھہرا لیا تھا کہ "عیسائیوں کی زمین جو کافروں کے قبضہ میں چلی گئی ہے اسے واپس لینا چاہیئے۔" اس پردہ آج تک قائم ہے، اگرچہ تہذیب و شائستگی کے پردے میں یہ تحریک عموماً نہیں بھی ظاہر کی جاتی، پھر بھی درپردہ یورپ کا جہاد اب تک جاری ہے۔ اور ان کی کوششوں کا رُخ برابر اسی طرف ہے کہ شاہنشاہ روما کا ہر جزو مسلمانوں سے واپس لے لیا جائے پس اس کا امکان ہے کہ بلا اشتعال فرانس، اسپین، آسٹریا یا اٹلی سواحلِ افریقہ پر حملہ کر بیٹھیں۔ اگر

۱؎ چند سال قبل ایک انگریز کپتان کا حاجیوں کے جہاز کو بیچ سمندر میں چھوڑ کر اکدم بھاگ جانا نہایت افسوسناک ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس نے اپنے بھتیجے کو بھی الگ ہو جانے کو کہہ دیا تھا۔ لیکن اس نے ازراہِ ہمدردی ایسا نہیں کیا۔ انگریز عدالت نے اس کپتان کو صرف اس قدر سزا دی کہ دو سال کے لیے معطل کر دیا۔

ایسا ہوا تو اس جانب اسلام کی سیاسی قوت میں انحطاط عظیم واقع ہوگا۔ لیکن اس کی تلافی وسط افریقہ میں ہوگی۔ حبشی نسلیں صرف مسلمان ہی نہیں ہو جائیں گی بلکہ عربی بن جائیں گی۔ اور بالآخر وہ نئی قوت اسلامیہ کا آلہ کار بن جائیں۔ میرا خیال ہے کہ یورپ کی قومیں اٹیلس پہاڑ کی جانب جنوب میں زیادہ دنوں تک قیام نہیں کر سکیں گی۔ یورپی مداخلت ہی سے ساحل بربری پر محبت از سر نو تازہ ہو جائیں گی۔

زوال سلطنت عثمانیہ سے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچے گا اور اس نقصان کے لیے اسلام کو تیار رہنا چاہیے۔ یہ نقصان صرف ملکی نہ ہوگا بلکہ ملی بھی۔ اس لیے کہ وہ مسلمان جو ممالک مفتوحہ روس وغیرہ میں ہیں وہ سب عیسائی ہو جائیں گے۔ یہی حال غالباً اول شمالی ایران میں مخلوط النسل آبادی کا بھی ہو جو ارمنی عیسائیوں سے بہت کچھ مماثل ہیں۔

(۹) دنیائے اسلام کی بابت پیشگوئیوں کا خلاصہ

۱۔ رقبۂ حکومت مذہبیہ میں کمی:۔

میرے خیال میں تو نہ مسلمانوں کے دشمنوں کو اس پر خوش ہونے کا محل ہے اور نہ خود مسلمانوں کو اس پر حزن و ملال کا کہ ان کے رقبۂ حکومت میں سلطنت عثمانیہ کے زوال کے بعد کمی ہو جائے گی بلکہ مجھے تو اس میں اسلام کی بہتری کے آثار نظر آرہے ہیں۔

(الف) سلطنت عثمانیہ سے اس وقت صرف ایک نمائشی جلوہ ہے اور وہ رونق بھی قوی ... کھو کر اسلام نے حاصل کیا ہے۔ ترکوں کی سیاسی کامیابی نے صدیوں سے اسلام کو اپنے اخلاقی وزن کا پلہ مساوی رکھنے میں دقتیں پیدا کر دی تھیں۔ اُن کے زوال کے بعد ان اقوام اسلامیہ کو رفعت و عظمت نصیب ہوگی جو مذہبی اغراض کی قائم مقامی کرنے کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ قسطنطنیہ کی جگہ قاہرہ لے گا اور تاتاریوں کے عوض اہل عرب ہو جائیں گے۔[۱]

(ب) زوال عثمانیہ کے بعد مسلمانان عالم دنیاوی عارضی قوتوں کے بجائے اپنی مذہبی و اخلاقی قوت کی

---

[۱] ملاحظہ ہو اقبالؒ سے: اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے — کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اصلاح کی طرف زیادہ مائل ہوں گے۔ ترکیہ اب وہ گراں بار خلافت سنبھالنے کے لائق نہیں رہا۔ اس طرح اسلام سیاسی ابتری کے داغِ بدنامی سے بچ جائے گا اور اس کے منشاء سادہ وسہل و بہتر وقوی ہو جائیں گے۔

۲۔ مذہب کے دائرہ اثر میں وسعت:۔

اسلام بہ نسبت زور اسلحہ کے اس مذہبی وروحانی طریقہ سے مشرقی وجنوبی ایشیا میں زیادہ نمایاں کامیابی حاصل کرے گا۔ اور یہ یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن اس براعظم کا یہی عام مروجہ مذہب بن جائے۔

زمانہ حال میں اسلام نے جو اخلاقی ترقی جزائر ملایا، چین اور تاتاری اور ہندوستان میں کی ہے اس سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہے کہ محمدیت مخالف سلطنت میں نہ صرف بطور خود قائم رہ سکے گی۔ بلکہ تمام حریفوں کے مقابلہ میں بھی قائم رہے گی اور مذہب بُدھ کے انحطاط و زوال کے بعد عیسائیت نہیں بلکہ اسلام ہی وہ پیرایہ ہوگا۔ جس میں بالآخر ممالک موقوعہ درمیان خطوط سرطان جدی (یعنی منطقہ حارہ) میں خدا کی پرستش ہوگی۔

ان دو وجوہ کی بناء (بشرطیکہ مسلمانوں نے اپنی اصلاح کی) زوال اسلام کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ممالک کے نقصان سے اسلام کی بربادی کی مجھے کوئی علامت نظر نہیں آتی۔

۳۔ شمالی افریقہ:۔

مصر اگر دشمن ہوا تو پھر انگلستان کا اثر شمالی افریقہ سے جاتا رہے گا۔ اور اگر قاہرہ کی مذہبی مخالفت فوجی اثر سے دبائی گئی، تو بھی اس سے ہمیں ہمیشہ کے لیے ایک دھمکی رہے گی۔ یہ بھی غلط ہے کہ مصر ساحل بربری کی طرح، جس کے ہاتھوں میں آجائے گا، وہ مصریوں کی مذہبی ذہنیت کو بدل دے گا۔ وہاں کے مفصلات کی آبادی کسی صورت میں ایسی گئی گزری نہیں کہ وہ کسی سے مقابلہ کرنے میں ڈر جائے خواہ وہ اطالوی ہوں یا یونانی یا بالٹی۔ منطقہ حارہ کے نیچے جو زندگی کی حالت ہوتی ہے (اور جس سے مصری بخوبی واقف ہیں) وہ مصریوں کو یورپین کالونی بننے سے ہمیشہ کے لیے بچالے گی۔ شہروں میں اجنبی بھرے جا سکتے ہیں۔ لیکن قلب ملک غیر مبدل رہے گا اور ہندوستان کی طرح اس بات سے انکار کرے گا کہ کسی اجنبی ملک کی تہذیب وشائستگی کے سانچے میں خود کو ڈھال لے۔ پس مصر میں محمدیت خود کو بہ استحکام قائم رکھے گی۔

۴۔ ملک کافری :۔

یہ بہت جلد حلقہ بگوش اسلام ہو جائے گا اور گو ہماری زندگی میں اس کی تکمیل نہ ہو لیکن بنا بریں کہ محمدیت خطِ استوا سے جانب جنوب بہت دور تک پھیل چکی ہے یہ ایک نہ ایک دن ممکن ہے۔

۵۔ انگلستان کا ہندوستان میں حشر :۔

بوجہ حسد دیگر ممالک (اگر انگلستان نے اپنے تعلقات مسلمانانِ ہند سے ایسے ہی بے خبرانہ رکھے) ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنا آلہ کار بنا لیں گے اور پھر مسلمانانِ ہند بھی انگریزوں کے دشمن ہو جائیں گے اور گو فوراً اس قابل نہ بھی ہوں کہ اپنی مخالفت کا اثر دکھائیں تاہم جب ہم پر کسی دم برا وقت آیا، اسی کے ساتھ ان کو بھی موقع مل جائے گا۔

۶۔ مسلمانوں کو میرا مشورہ :۔

اگرچہ میں نے ان کے فوری آنے والے مستقبل کی تیرہ و تار تصویر کھینچی ہے لیکن انھیں مطلق نا امید نہ ہونا چاہیے گو ان کی شہنشاہیت کے دن ختم ہو چکے لیکن ان کی خود مختار حکومتوں کی صبح پھر بخوبی طلوع ہو سکتی ہے[1] میری پیش بینی میں ان کے لیے افریقہ کی اور جنوبی ایشیا کی مذہبی و روحانی وراثت نظر آتی ہے اور چونکہ ان نسلوں کی عقل و دانش جن کو انھوں نے مبدل بہ اسلام کیا ہے ان کی موجودہ فرماں روائیوں کے برابر ہو جائے گی اور یورپ اپنے کام سے تھک کر افریقہ و ایشیا کی حکومت سے دست بردار ہو جائے گا۔ لہٰذا اُن ممالک کی دنیاوی وراثت بھی اُن کے (مسلمانوں کے) لیے نظر آتی ہے۔ اس کے وقوع میں کتنا عرصہ باقی ہے۔ یہ ہم نہیں جانتے۔

اُن کے نبیؐ نے پیش گوئی کی ہے کہ اسلام پر دو ہزار برس نہیں گزرنے پائیں گے کہ ظہور مہدی ہوگا۔ اور اب چودھویں صدی شروع ہوتی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کی نجات اتنے دنوں تک ملتوی نہیں رہ سکتی، ایک "شخص عادل" اب بھی ان کی رونق گزشتہ کو دوبارہ لا سکتا ہے۔ لیکن یہ بہ زور و جبر حاصل نہ ہوگی۔ جب اُن کی زبوں انتہا کو پہنچ جائے گی تب وہ ختم ہو گی اور جب انھیں دوبارہ عروج نصیب

---

[1] ملاحظہ ہو اقبالؒ ؎ دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی

ہونے لگے گا۔ اس وقت وہ دیکھیں گے کہ ان کا اصلی و صحیح کام پہلے سے شروع ہو چکا ہے اور جو لڑائی ان کو آیندہ لڑنی ہے وہ بہت پہلے سے ان کے دلوں میں موجزن ہے۔ جنھوں نے بجائے اس کے اپنی شکستِ قوت پر اور اپنی دنیوی شہنشاہی کی بداعمالیوں اور نمائشِ بیہودہ پر بیٹھے نوحہ کریں۔ اپنے طریقِ عمل کی اصلاح میں کوشش کی ہے اور اپنے قانون کو پاک و صاف بنایا ہے۔

محمدیت ایک رائے دخیال نہیں ہے، بلکہ ایک خاص و معین سیاسی نظم و نسق ہے اور ایک اور معین جغرافی حدود اس کی شرط میں داخل ہے۔ علاوہ بریں محمدیت ایسی قوت ہے جو بلا یکسو ہوئے نہیں رہ سکتی۔ محمدیت یا تو دوست بن کر رہے گی یا دشمن بن کر۔